قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا پچھترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

ستمبر 2018ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

''لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ'' (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



ایہہ پُتر ہٹاں تے نئیں وکدے

رکوع وسجود وعبادت کا مقصد

جب ذہنِ انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا تو وہ (بچے کی طرح) محسوس اشیاء ہی کو سمجھتا تھا اور اپنے خیالات کا اظہار بھی محسوس طور پر کرتا تھا۔ آج کل کی علمی اصطلاح میں یوں کہئے کہ اس کا علم (Sense Perception) یعنی حواس کے دائرہ میں محدود تھا۔ وہ ہنوز تصورات (Concepts) کے ذریعے حصولِ علم یا اظہارِ خیالات کی منزل تک نہیں پہنچا تھا۔ یعنی وہ (Formalism) کی منزل میں تھا۔ اس نے ''خدا'' کے لئے محسوس پیکر تراش رکھے تھے۔ پوجا پاٹ کے طریق اور دیگر مذہبی رسوم و تقاریب میں بھی سارا زور شکل (Form) پر دیا جاتا اور اسے ہی مقصود بالذات سمجھا جاتا تھا۔

قرآن کریم نے اپنی تعلیم میں انسان کو عہد طفولیت سے نکال کر سن شعور اور بلوغت میں لا کر مخاطب کیا ہے۔ وہ علم بالحواس کے ساتھ تصوراتی علم پر بھی زور دیتا ہے اور دین کے معاملہ میں بھی شکل کی بجائے معنویت (مقصود و مفہوم) کی اہمیت کو نمایاں کرتا ہے لیکن وہ شکل کو بالکل ترک نہیں کرتا۔ عبادات میں رکوع وسجود میں انسان سچ مچ اپنا سر خدا کے سامنے جھکاتا ہے۔ جسم کی ان حرکات و سکنات کے پیچھے ایک فلسفہ کارفرما ہے جسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں متوازیت (Parallelism) کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے نفس (Mind) کے ارادے اور اس کے جسم کی حرکت میں گہرا تعلق ہوتا ہے اور یہ دونوں متوازی چلتے ہیں۔ اس لئے کہ انسان کو تصورات کی تعبیر کے لئے شکل (Form) کے بغیر نہ چارہ ہوتا ہے، نہ تسکین۔ بڑے سے بڑا تصوراتی مفکر بھی جب بات کرتا ہے تو اس کے ہاتھ، پاؤں، سر، آنکھ کی حرکات ناگزیر ہوتی ہیں۔ وہ ان محسوس اشارات کے بغیر اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کر ہی نہیں سکتا۔ (وہ اس طرح مجرد حقائق (Abstract Truths) کو بھی محسوس مثالوں سے سمجھاتا ہے) یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے (Form) سے اس قدر بلند ہو جانے کے باوجود، بعض مقامات میں اسے باقی رکھا ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کا اس طرح خدا کے سامنے سر جھکا دینا، اس کے اس جذبہ اور ارادہ کا محسوس مظاہرہ ہوگا کہ وہ قوانین خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔ یعنی وہ خدا کی کامل اطاعت کا عہد کرتا ہے۔ یہ ''محکومی'' درحقیقت، زندگی کی بلند، مستقل اقدار کو ازخود اپنے اوپر عائد کرنا ہوتا ہے۔ کسی کی خارج سے عائد کردہ پابندیاں نہیں ہوتیں۔ نہ ہی اس میں (Worship) کا وہ مفہوم ہوتا ہے جسے زمانہ قدیم کے انسان نے، فطرت کی قوتوں سے ڈر کر، انہیں خوش کرنے کے لئے، اپنے ذہن سے وضع کیا تھا۔ اگر انسان کا

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ستمبر 2018ء

جلد 71 | شمارہ نمبر 09

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: آل ورلڈ مسلم کانفرنس۔۔۔حج	ادارہ	4
اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں	عنایت اللہ	8
دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبہ پاکستان	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	17
مستقبل کے وزیراعظم کی وکٹری سپیچ	خواجہ ازہر عباس، کراچی	27
نوجوانوں کا صفحہ: نخلِ سینا: نشست نمبر 9	محمد علی صابر صدیقی	36
فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ	بشیر احمد عابد	43
بچوں کا صفحہ: سنی سنائی بات پر عمل نہ کرو	ادارہ	51

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 550 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ
بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Manzil ba Manzil **(منزل بہ منزل) Chapter 3: Spring's Message**
(*Payam-e Fasl-e Bahar* پیام فصل بہار) – Message to Fellow-Ambassadors
By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam) **55**

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: 0321-4460787
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

آل ورلڈ مسلم کانفرنس۔۔۔حج

جب سے انسان نے آنکھ کھولی ہے وہ اسی تگ وتاز میں غلطاں وپیچاں رہا کہ وہ کون سی صورت پیدا کی جائے کہ اس دنیا میں انسان امن وسلامتی سے رہ سکیں۔ اسے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان گنت تجارب کی بھٹیوں اور سنگلاخ وادیوں سے گزرنا پڑا۔ لیکن وہ مقصود حاصل نہ کرسکا۔ زمان ومکاں ہر آن بدلتے رہے۔ نظریات حیات میدان تصادم میں برسرِ پیکار رہے۔ Antithesis, Thesis اور Synthesis کا عمل عقل محض کی ابلہ فریبیوں میں عافیت کوش رہا۔ اس طرح انسان اپنے ہی ہاتھوں سراب کا شکار ہوتا رہا۔ مدت کے بعد پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر اقوام مغرب نے جمیعتہ الاقوام (League of Nations) کی طرح ڈالی جو کردار اور عمل کے فقدان کی وجہ سے بری طرح ناکام ہوئی۔ علامہ اقبالؒ نے تو اسے کفن چوروں کی جماعت کہا تھا۔ اس کی ناکامی کی وجہ (Mr. Reeves) اپنی کتاب (Anatomy of Peace) میں لکھتا ہے کہ ''لیگ آف نیشنز'' کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بین الاقوامیت کے غلط تصور پر قائم ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کی مختلف قوموں کے نمائندوں کو یک جا کر کے باہمی بحث وتمحیص سے دنیا کا امن قائم رکھا جا سکتا ہے۔ اس ناکام تجربے کے بعد ''لیگ آف نیشنز'' کی جگہ یعنی اس کا نام بدل کر (United Nations Organisation) اقوام متحدہ کی تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس طرح سے یہ ناکام ہوئی ہے۔ اس کی مثال بھی تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ اس طرح کہ اس کی ایک سیکیورٹی کونسل ہے جس کے پندرہ مستقل رکن ہیں۔ ان میں سے پانچ یعنی امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس اور چین کو حق استرداد (Veto) کا اختیار دیا ہوا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی معاملہ سیکیورٹی کونسل منظور کردے تو ان میں سے کوئی رکن بھی اسے رد (Veto) کرسکتا ہے جس سے تمام کارروائی منسوخ ہوجاتی ہے۔ گویا ان کا یہ عمل ان کے اپنے وجود کی نفی ہے۔ ظاہر ہے جو جماعت اپنے وجود کی خود نفی کردے منطقی طور پر (Virtually) اس تنظیم نے پورے کے پورے ادارے کو کالعدم کرنے کے خود اسباب پیدا کر رکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دنیا کے مسائل حل کرنے میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ دوسری اقوام کو تو چھوڑیئے، مسلمانوں کا کوئی مسئلہ آج تک حل نہیں ہوسکا۔ کشمیر کا مسئلہ 1948ء سے اس کے ایجنڈا پر

ہے اور ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ اسرائیل سے عرب علاقے خالی نہیں کرا سکی۔ افغانستان اور عراق آگ کے شعلوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ اس کا کوئی فیصلہ نہیں کرا سکی۔ یہ چند مسائل ہیں جن کا تعلق عالم اسلام سے ہے۔ باقی علاقوں کے مسائل کا بھی کوئی خاطر خواہ حل نہیں ہو سکا۔ کافی عرصہ ہوا لندن کے اخبار ''ڈیلی میل'' نے لکھا تھا کہ جمعیت اقوام اپنی موجودہ ہیئت میں امن عالم کے لئے سخت خطرہ کا موجب ہے اس لئے اسے فوراً ختم کر دینا چاہئے'' اور اس کی وجہ (Mr. Reeves) کے الفاظ میں یہ ہے کہ ''ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے۔ وہ قوموں کے باہمی تعلقات کا مسئلہ نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم نے انسانی معاشرہ میں جو خلجان پیدا کر رکھا ہے اسے کس طرح دور کیا جائے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ خلجان نیشنلزم یا انٹرنیشنلزم کے ذریعے دور نہیں ہو سکتا۔ جس چیز کی ضرورت ہے وہ نوع انسانی کی برادری ہے نہ کہ بین الاقوامیت۔ یعنی یہ وہی چیز ہے جسے علامہ اقبال نے کہیں پہلے ان الفاظ میں کہا تھا کہ ؎

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریق ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

یہ حشر ہوا اس نظریہ حیات کا جو وحی کی راہنمائی سے محروم تھا اور صرف عقل کے گھوڑے پر سوار تھا۔

لیکن صدیوں پہلے وحدت آدم کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے مرکز انسانیت یعنی خانہ کعبہ کو از سرِ نو تعمیر کیا کیونکہ مرکز کے بغیر انسانوں کا ایک برادری بننا اور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا ناممکن ہے۔ چنانچہ جب تعمیر کعبہ مکمل ہو چکی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (22:27) ''تمام نوع انسانی کو یہاں جمع ہونے (حج) کا اعلان کر دے'' اور اس کی غایت یہ بیان فرمائی کہ لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ (22:28) ''تا کہ وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں کہ نظام خداوندی کس طرح عالمگیر انسانیت کی منفعت بخشیوں کا ضامن ہے۔''

نصوص قرآنی سے حج کی جو تفصیلات ظاہر ہوتی ہیں وہ اس طرح ہیں کہ تمام دنیا کے انسان بلا تفریق رنگ و نسل اور بلا امتیاز وطن و زبان، جو اس نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں کہ دنیا میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں، محکومیت صرف خدا کے قانون کی جائز ہے، جو انسانی تقاضوں کا ترجمان ہے، اپنے اپنے ملکوں سے اپنے نمائندے چنیں۔ یہ نمائندے اپنے میں سے ایک منتخب کردہ امیر کی زیر قیادت، مرکز وحدت انسانیت، یعنی بیت اللہ کی طرف روانہ ہوں۔ عرفات کے میدان میں ان تمام نمائندگان کا باہمی تعارف ہو۔ پھر یہ تمام امرا اپنے میں سے ایک امیر الامرا کا انتخاب کر لیں اور مختلف

ممالک کے احوال وظروف کو سامنے رکھ کر باہمی مشاورت سے ایسا پروگرام مرتب کرلیں جو آئندہ سال کے لئے اصولی طور پر بطور مشترکہ پالیسی اختیار کیا جائے۔ اس کو آج کل کی اصطلاح میں ''سالانہ ترقیاتی پروگرام'' (Annual Development Programme) کہا جاتا ہے۔ پھر ان کا منتخب کردہ امام اپنے خطبۂ حج میں اسی پروگرام کا اعلان کردے جو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد یہ تمام نمائندگان' مقام منیٰ میں جمع ہوکر اس اصولی پروگرام کی تفصیلات وجزئیات پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ ایک دوسرے ملک پر ان کے (Pros and Cons) کا عملی اثر اور ردعمل کیا ہوگا۔ وہاں باہمی مذاکرات بھی ہوں گے' اور دعوتیں اور ضیافتیں بھی ہوں گی جس کے لئے بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ (22:34) کا ذبیحہ تجویز کیا گیا ہے جسے عرف عام میں قربانی کہتے ہیں۔ آخر میں یہ نمائندگان طواف کعبہ کے بعد اپنے اپنے ملکوں میں واپس آجائیں گے اور اس طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے اپنے لوگوں اور نظم ونسق کو چلائیں گے۔ یہ ہے وہ عملی طریقہ جو قرآن حکیم نے تمام نوع انسانی کو ایک امت واحدہ بنانے اور ان کے تمدنی مسائل کا حل تجویز کرنے کے لئے بتایا ہے۔

قرآن حکیم کی رو سے اس اجتماع کی مکمل کارروائی کے لئے کم ازکم تین مہینے بتائے ہیں۔ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ (2:197) اس سے زیادہ بھی ہوسکتے ہیں۔

یہیں سے اقوام متحدہ نے بھی اپنے سالانہ اجلاس کے لئے کم ازکم تین مہینے مقرر کررکھے ہیں۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل

فریضۂ حج کا تقاضا ہے کہ اپنے اپنے ممالک کو لوٹ کر سب کچھ بھولنا نہیں بلکہ تم جہاں کہیں بھی ہو دنیا کے کسی گوشہ میں بھی ہو' زندگی کے کسی شعبہ میں مصروف تگ وتاز ہو اپنی توجہات کا رخ اسی مرکز کی طرف رکھو اور جو پروگرام وہاں سے مرتب کرکے لائے تھے۔ اس کا احترام کرنا ہوگا اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچانا ہوگا' کیونکہ آئندہ سال اپنی Progress Report وہیں جاکر پیش کرنا ہوں گی۔ اسی لئے خانہ کعبہ کو قبلہ کہا گیا ہے جس کو ہر وقت اپنے سامنے رکھا جائے۔ اگر کسی وجہ سے تکمیل پروگرام (A-D-P) میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو اس کے (Bottle Necks) حج کے دوران بیان کرنا ہوں گے تاکہ ان کا تدارک کیا جاسکے۔ اسی لئے حج کا مقصود قرآن حکیم میں خاص طور پر دو مقامات پر مختصراً بیان کردیا گیا ہے۔ ایک لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (22:28) تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس میں ان کے لئے کس قدر فائدے ہیں اور اس کی غائت قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (5:97) یعنی اس سے دنیا میں انسانیت قائم رہے۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ حج سے مقصود جمعیت آدم'' کی تشکیل تھا۔ لیکن آج حج چند رسوم کا بے جان اور بے مقصد مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ مسلمانوں کی لامرکزیت کی وجہ سے عالم اسلام چاروں طرف سے مصائب سے گھرا ہوا ہے۔ غیر خدائی قوتیں ان کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کئے ہوئے ہیں کہ دنیا کے نقشہ پر کہیں انکا نشان رہنے نہ پائے۔ لیکن ملت اسلامیہ تختۂ غفلت پر سوئی ہوئی خراٹے لے رہی ہے۔ مسلمان ملکوں پر جو گزر رہی ہے آسمان کی آنکھ بھی اس پر پرنم ہے۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے؟ حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد اور عورتیں اور بچے ہیں جو (ظالموں کے ظلم وتشدد سے عاجز آ کر) فریاد کر رہے ہیں۔ خدایا ہمیں اس بستی سے جہاں کے باشندوں نے ظلم وتشدد پر کمر باندھ لی ہے نجات دلا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا کارساز بنا دے اور اپنی طرف سے کسی کو ہماری مددگاری کے لئے کھڑا کر دے''۔ القرآن (4:75)۔

پاکستان تو کجا دنیا کا کوئی ملک ایسا ہے جو خدا کے متذکرہ حکم کے تحت مسلمانوں کی مدد کو پہنچ سکے؟ یہ وہی معاشرہ یعنی مرکز ملت (Central Authority) ہوسکتا تھا جس کی خصوصیت اقبالؒ کے الفاظ میں یہ ہوتی کہ ؎

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اسلامی معاشرہ یعنی مرکز ملت کی حیثیت آنکھ جیسی ہوتی ہے۔ اگر انسانی جسم کے کسی حصہ میں تکلیف ہو تو آنکھ کو چین نہیں۔ اسی طرح اگر دنیا کے کسی حصہ میں کسی ایک مسلمان پر بھی ظلم ہو رہا ہو تو مرکز ملت حرکت میں آ جاتا ہے اور ظلم کو کیفر کردار تک پہنچاتا ہے۔ لیکن افسوس! اس وقت وہ مرکز ملت کہاں جو قرآن کے قانون اور حکم کی قوت نافذہ بنتا!

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے خدائی

ہماری لامرکزیت ہمارے زوال اور انحطاط کا سبب ہے۔ اس لئے حج چند رسوم کا بے جان اور بے مقصد مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ مسلمانوں کے نمائندے مختلف مقامات پر کانفرنس منعقد کرنے پر ہی اکتفاء کئے ہوئے ہیں۔ عملی طور پر کچھ نہیں ہو سکا۔ لیکن ؎

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

یہ نمی تمسک بالقرآن سے پیدا ہوگی اور پھر جب ہم نے اپنے اللہ سے' بھلایا ہوا عہد استوار کر لیا اور پھر اسی مرکز کو زندہ کر دیا' جس کی زندگی سے تمام نوع انسانی کی زندگی وابستہ ہے' اقوام عالم کی امامت ہمارے حصے میں آ جائے گی۔ ہماری زندگی کے چشمے کی سوتیں عرفات کے منبر سے پھوٹیں گی اور اسی سے ہماری کشت حیات سرسبز وشاداب ہوگی۔ آج مسلمانوں کو حج کا فریضہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

عنایت اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیادِ 6 ستمبر 1965ء

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں

(ماخوذ طلوعِ اسلام ستمبر 1967ء)

عنایت اللہ صاحب، حلقہ طلوع اسلام میں ایک عرصہ سے متعارف ہیں لیکن 1965ء کی جنگ کے بعد انہوں نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی تھی انہوں نے جہادِ پاکستان کے غازیوں اور شہیدوں کی یاد کے چراغ، اپنے خونِ جگر کے روغن سے مسلسل جلائے رکھے۔ وہ چھاؤنی چھاؤنی، نگر نگر اور بستی بستی پھرے تاکہ تاریخِ پاکستان کے اس محیر العقول معرکہ کے عینی شاہدوں سے واقعات سنیں اور اکٹھے کریں۔ اس طرح انہوں نے چمن میں بکھری ہوئی اس داستان کی ایک ایک پتی کو اپنی مژگانِ عقیدت سے جمع کیا۔ انہی میں سے چند شگفتہ و شاداب پتیاں وہ بزمِ طلوع اسلام میں بھی لے کر آئے جنہیں ایک بار پھر ہدیۂ قارئین کیا جاتا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

بین الاقوامی شہرت یافتہ امریکی ہفت روزہ ''ٹائم'' کے وقائع نگار، لوئیس کرار، نے جنگِ ستمبر کے دوران میں سیالکوٹ سیکٹر کے جھلسے ہوئے، میلوں وسیع، کھیتوں میں بھارت کی بکتر بند قوت کے جلے ہوئے پرخچے (جنہیں بھارتی ٹینک کہا کرتے تھے) اپنی آنکھوں سے دیکھے تو اُس نے اِس سیکٹر کے پاکستانی کمانڈر سے حیرت زدہ ہو کر پوچھا ___ ''آپ نے اس قدر تھوڑی سی طاقت سے بھارت کی اس قدر زیادہ قوت کو کسی طرح شکست دے لی ہے؟''

ہمارے جری کمانڈر نے فاتحانہ مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ''اگر حوصلہ اور جذبہ روپے پیسے سے خریدا جا سکتا تو بھارت کے جنگ پسند حکمران یقیناً یہ دونوں چیزیں بھی امریکی امداد میں حاصل کر لیتے۔''

ہمارے فاتح سالار کا یہ جواب اپنی جگہ مکمل ہے ___ حوصلہ اور جذبہ ___ اس جواب نے یہودی ہفت روزہ ''ٹائم'' کے امریکی جنگی وقائع نگار کو مطمئن کر دیا تھا، لیکن تاریخ مطمئن نہیں۔ تاریخ تفصیلات پوچھ رہی ہے کیونکہ جنگِ ستمبر میں ذاتی حوصلے، جذبے اور حب الوطنی

کے کچھ ایسے مظاہرے ہوئے ہیں جنہیں تاریخ اپنی جھولی میں ڈالنے سے لرز رہی ہے، کہ اسے اس متاعِ عظیم کی وسعت اور اپنی تنگ دامانی کا پورا پورا احساس ہے۔

یہ سوال کہ اس قدر تھوڑی طاقت نے اتنی زیادہ قوت کو کس طرح شکست دے لی ہے؟ لوئیس کرارنے نہیں، تاریخ نے پوچھا ہے۔ تاریخ نے یہ سوال صدیوں پہلے بدر کے میدان میں بھی پوچھا تھا۔ تاریخ بدر کے میدان میں بھی لرز اٹھی تھی اور صدیوں بعد تاریخ نے ایک بار پھر لاہور اور سیالکوٹ کے میدانوں میں اپنے سینے میں وہی لرزہ محسوس کیا ہے۔ لیکن اب کے یہ لرزہ نہیں، بھونچال کا شدید جھٹکا تھا جس نے عالمی جنگوں کی تاریخ کی بنیادوں تک کو ہلا ڈالا ہے کیونکہ اُس نے پاک فوج کی پنجاب رجمنٹ کے نائک غلام احمد کا نام پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ آیئے، اسی غازی کا کارنامہ سن لیجئے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب اپنے اگلے دستے بی آر بی کے اگلے کنارے سے ہٹ کر ورلے کنارے پر مورچہ بند ہوئے تو بٹالین کمانڈروں، بریگیڈ کمانڈروں اور خود ڈویژن کمانڈر نے بھی محسوس کیا کہ اپنے سپاہی دفاع پر نہیں لڑنا چاہتے، وہ بڑھ کر دشمن پر وار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی نفری بہت تھوڑی تھی۔ تین چار پیادہ پلٹنیں اور ایک ٹینک یونٹ کوئی نفری نہیں ہوتی۔ اس ذرا جتنی نفری کا سامنا بھارت کے پورے ڈویژن (نمبر 15) سے تھا جسے نہ صرف طیاروں کی بلکہ اڑھائی سو سے زیادہ توپوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس ڈویژن کو بھارت کے نامور چھاتہ بردار نمبر پچاس بریگیڈ کی کمک مہیا کی گئی تھی اور اس سے پیچھے، امرتسر کے گردونواح میں، نمبر 23 مونٹین ڈویژن (جسے بھارتیوں نے چین کے بہانے امریکہ سے تیار کرایا تھا) پا برکاب تھا۔ جنرل چوہدری کا یہ اعلان کہ وہ نو بجے تک لاہور پر قابض ہو چکا ہوگا، مجذوب کی بڑ نہیں تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ پاکستان کے پاس اُس کے لشکر کی اچانک یلغار کو روکنے کے لئے کچھ نہیں۔ ہوا بھی یوں ہی کہ پاک فوج نے ڈوگرئی سے راوی سائیفن (مقبول پورہ) تک کے تمام اگلے دستوں کو پیچھے ہٹا لیا تھا اور دشمن بی آر بی تک تقریباً آن پہنچا تھا۔ لیکن پاک فوج کے ان مٹھی بھر دستوں کے مورچوں سے نعرۂ تکبیر کے ساتھ دو اور نعرے گونجے ___ ''پاکستانیو! یہ وقت پھر نہیں آئے گا'' ___ اور دوسرا نعرہ تھا ___ ''پاکستانیو! دلی پہنچو'' ___ اور ایک تیسرا نعرہ بھی گونجا جو کئی بار سنائی دیا ___ ''پاکستانیو! آج بے غیرت نہ ہو جانا۔ شاستری کے گھر تک پہنچو۔''

جس طرح جنرل چوہدری نے اپنی نفری کو دیکھ کر جنگ کی اسکیم بنائی تھی اگر اسی طرح ہمارے کمانڈر اپنی صرف نفری کو پیش نظر رکھتے تو ان کے سامنے ایک ہی جنگی چال تھی کہ لاہور سے بھی پیچھے ہٹ کر راوی کے شاہدرے والے کنارے مورچہ بند ہوتے لیکن انہوں نے جب اپنے سپاہیوں کا غیظ وغضب اور بے پناہ جذبہ دیکھا تو بریگیڈیئر آفتاب احمد نے ڈویژن کمانڈر کو خود اعتمادی سے کہا ___ ''جناب! ہم دشمن پر جوابی حملہ کر سکتے ہیں۔'' ___ چنانچہ لاہور کی دہلیز پر وہی فیصلہ ایک بار پھر کیا گیا جو صدیوں پہلے بدر کے میدان میں کیا گیا تھا اور جسے صلاح الدین ایوبی نے کئی بار دہرایا تھا۔ یہ وہی فیصلہ تھا جو ایوبی کے پوتے الکمال کی بیوی شجرۃ الدرّ نے منصور کے میدان میں صلیبیوں کے خلاف

کیا تھا۔ (الکمال شہید ہوگیا تو اس کی بیوی نے فوجوں کی کمان سنبھال لی تھی۔ دوسری طرف صورت یہ تھی کہ سارا یورپ مسلمانوں سے فیصلہ کن معرکہ لڑنے کے لئے امڈ آیا تھا۔ شجرۃ الدّر نے پہلا حکم یہ دیا تھا کہ کسی کو یہ علم نہ ہونے پائے کہ سالارِ اعظم الکمال شہید ہوگیا ہے۔ باقی داستان بہت طویل ہے۔

بدر کا فیصلہ جب لاہور کے میدان میں دہرایا گیا تو اپنی صرف دو کمپنیاں جن کی نفری تین سو تیرہ ہی کے لگ بھگ تھی، چھ ستمبر کی بھیانک رات کی تیرگی میں راوی سائیفن کی راہ بی آر بی سے پار چلی گئیں اور دشمن کی چار پلٹنوں (ہر پلٹن کی نفری ایک ہزار) پر ٹوٹ پڑیں اور دشمن کی چار ہزار نفری کو دھکیلتی، لہولہان کرتی اپنی سرحد سے نکل کر بھارت کی رانی اور طوطی کی چوکیوں پر قابض ہوگئیں ___ تاریخ اسلام کے لئے یہ معرکہ کوئی انوکھا نہیں لیکن عالمی جنگوں کی تاریخ سوچ میں بیٹھی ہے، سر جھکائے ہوئے!

میں ایک طویل داستان کو بے دردی سے سمیٹتا چلا جا رہا ہوں لیکن مجبور ہوں کیونکہ یہ ضخیم کتابوں کا (ایک کتاب کا نہیں کئی کتابوں کا) موضوع ہے۔ ہماری دو کمپنیوں نے بی آر بی سے پار ڈوگرئی سے ڈیڑھ میل آگے (واہگہ روڈ کے تیرہویں اور چودھویں سنگِ میل کے درمیانی علاقہ میں) جا مورچے کھودے پہلے روز ان کمپنیوں کی نفری تین سو چھبیس (326) تھی اور فائر بندی کے وقت وہ کل پچاس رہ گئے تھے۔ یہ مورچے لاہور کی قربان گاہ تھی جہاں یہ جانباز لہولہان ہوتے رہے، شہید ہوتے رہے، کٹتے رہے، مگر گرجتے رہے ___ ان میں بیشتر کی قبروں کے نشان تک مٹ چکے ہیں کیوں کہ دشمن لاشوں کو پیچھے لانے کی مہلت نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ انہیں ان کے ساتھی وہیں کہیں (بعض کو مورچوں میں ہی) دفن کرتے رہے۔ پھر خود بھی شہید ہوگئے اور مٹی کی ان ڈھیریوں پر ٹینک پھر گئے۔ اب ان پر کھیتیوں کی ہریالی جھوم رہی ہے۔ گندم کے کسی خوشے کو سونگھ کے دیکھو، اس میں سے تازہ لہو کی بھینی بھینی خوشبو آتی ہے۔

ہاں تو، میں نائک غلام احمد کی بات کر رہا تھا۔ وہ انہی مورچوں میں تھا۔ میں اس سرفروش غازی کو علامت کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ ذرا دیکھئے کہ خالی وردی میں لپٹے ہوئے ہمارے یہ گمنام سے اَن پڑھ دیہاتی کس طرح موت کے ساتھ چھیڑ خانی کرتے رہے ہیں۔ غلام احمد ٹینک شکن گن (آر آر) کا گنر تھا۔ یہ گن جیپ پر نصب ہوتی ہے اور زمین پر بھی لگائی جاسکتی ہے۔ ایک روز دشمن کے بہت سے ٹینک واہگہ سے ذرا اس طرف شمال سے جنوب کی طرف ایک دوسرے کے پیچھے سڑک پار کر رہے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ لاہور پر ایک اور حملہ کرنے کے لئے بکتر بند قوت کہیں مرکوز کر رہا ہے۔ ڈوگرئی کے اگلے مورچوں کے پیادہ سپاہی ان ٹینکوں کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتے تھے۔ ٹینک سے ٹینک یا طیارہ لڑا کرتا ہے۔ لیکن نائک غلام احمد نے اپنے کمپنی کمانڈر سے کہا ___ ''جناب! ایک تماشہ کروں؟'' ___ ذرا غور فرمایئے، اُس نے ''تماشے'' کا لفظ استعمال کیا تھا ___ اور کس وقت کیا تھا؟

اس کے کمپنی کمانڈر نے مجھے بتایا کہ میں ہنس پڑا اور کہہ دیا ___ ''ہاں غلام احمد، کرو تماشہ، مرنے سے پہلے تماشہ ہی دیکھ لیں'' ___ کمپنی کمانڈر بتاتا ہے کہ میں اسے محض

مذاق سمجھ رہا تھا اور مجھے قطعاً علم نہیں تھا کہ غلام احمد سنجیدگی سے کچھ کرنا چاہتا ہے۔ میں نے مذاق کا جواب مذاق میں دیا تو غلام احمد بھاگ کر اپنی آر آر کی جیپ پر جا بیٹھا اور جیپ کو ڈھکی چھپی پوزیشن سے نکال کر کھلی سڑک پر لے گیا۔ وہاں سے اُس نے جیپ کو واہگہ کی سمت (جہاں سے دشمن کے ٹینک گزر رہے تھے) انتہائی تیز رفتار پر چھوڑ دیا۔ ہم دم بخود کہ یہ شخص خودکشی کرنے جا رہا ہے۔ سامنے دشمن کے ٹینک، اِدھر یہ اکیلا اور وہ بھی کھلی سڑک پر مگر وہ دُور نکل گیا تھا، اُسے روکا نہیں جا سکتا تھا۔

لیکن نائک غلام احمد ''تماشہ'' دکھانے گیا تھا۔ اُدھر ایک اور ٹینک سڑک پر چڑھا، اِدھر غلام احمد نے جیپ کی اسی تیز رفتار سے ایک گولہ فائر کیا۔ دشمن کا ٹینک کئی فٹ اوپر اچھلا اور آگ کا مہیب شعلہ بن گیا۔ دوسرا ٹینک سڑک کی طرف آ رہا تھا۔ وہ ابھی کھیتوں میں تھا۔ غلام احمد نے اسی رفتار پر جیپ کو ذرا گھمایا اور دوسرا گولہ فائر کر دیا۔ دشمن کا وہ ٹینک زخمی بھینسے کی طرح چکرایا اور ساکن ہو گیا۔ غلام احمد نے جیپ روک لی اور اُلٹے گیئر میں ڈال دی، کیونکہ باقی ٹینکوں نے اپنی گنوں کا رُخ اس طرف کر لیا تھا۔ نائک غلام احمد کی جیپ کھلی سڑک پر ان کے سامنے تھی۔ بیک وقت دو تین گولے غلام احمد کی جیپ کے سامنے آ کر پھٹے۔ جیپ کا انجن صاف اُڑ گیا اور غلام احمد زخمی ہو گیا۔ لیکن اُس نے جیپ سے گن الگ کر لی۔ اس دوران اس کے اردگرد گولے پھٹتے رہے اور اس کا خون تیزی سے بہتا رہا۔ لیکن وہ گن کو قریب ہی زمین پر آڑ میں لے گیا اور فائر کرتے کرتے رینگ رینگ کر پیچھے ہٹنے لگا۔ آخر وہ جسم کا آدھا خون بہا کر مورچے میں واپس آ گیا۔ کمپنی کمانڈر نے آتے ہی سینے سے لگا لیا۔ اور کہا ___ ''بیوقوف! تم مرنے گئے تھے؟'' ___ غلام احمد نے ہنس کر کہا ___ ''نہیں جناب! میں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ تماشہ کرنے جا رہا ہوں؟'' ___ اور جب اُسے ہسپتال بھیجا جانے لگا تو اُس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ''یہ تو معمولی زخم ہیں۔'' ___ اُس نے ان گہرے زخموں کو اپنی فیلڈ پٹی سے چُھپا لیا۔ فائر بندی تک اُس نے اسی طرح کئی اور ٹینک تباہ کئے تھے۔

اور اسی طرح کا ایک اور حوالدار انہی مورچوں میں تھا۔ فائر بندی سے ایک روز پہلے دشمن ان اگلے مورچوں کو کچلنے کے لئے بے شمار نفری سے حملہ آور ہوا اور اس قدر قریب آ گیا کہ گرنیڈوں کی جنگ شروع ہو گئی اس حوالدار کا بایاں بازو کہنی کے قریب سے کٹ گیا۔ اسی ہاتھ سے وہ گرنیڈوں کے پن نکالتا تھا۔ وہ ہاتھ ہی جسم سے الگ ہو گیا۔ اس جانباز نے پروانہ کی اور دانتوں سے پن نکال کر گرنیڈ پھینکتا رہا۔ کٹے ہوئے بازو سے خون فوارے کی طرح بہتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ خون بہنے سے بے ہوش ہو گیا۔

ذکر جب انفرادی شجاعت کا آ جاتا ہے تو بات کہیں ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔ صرف ایک کارنامہ اور سن لیجئے۔ عبدالمتین شہید بنگالی تھا۔ وہ پاک فوج کی ایک ٹینک رجمنٹ کا گنر (توپچی) تھا۔ اُس کے ٹینک کو گولہ لگا اور ٹینک جلنے لگا۔ اُس کے ہاتھ ایک دفعدار اور دو اور کرئیو (Crew) تھے۔ سب ٹینک سے کود آئے لیکن ٹینک کی توپ ابھی محفوظ تھی اور عبدالمتین شعلوں کی لپیٹ میں گولے فائر کر رہا تھا۔ دفعدار نے چلا کر کہا۔ ''متین! کود آؤ، ایمونیشن پھٹنے والا

ہے۔'' متین شہید جانتا تھا کہ اُس کے ٹینک میں ایمونیشن رکھا ہے جو دوسرے ہی لمحے پھٹے گا۔ لیکن اُس نے چیخ کر جواب دیا___ ''دشمن رینج (Range) میں ہے۔'' اور اس نے نہایت تحمل سے دشمن کے دو ٹینک تباہ کر ڈالے۔ مگر اُس کا ایمونیشن ہولناک دھماکے سے پھٹ گیا___ عبدالمتین شہید کی قبر کہاں ہے؟___ ہمارے سینوں میں! اُس کی لاش کا تو نشان بھی نہیں رہا تھا۔

میں نے یہ تین مثالیں پاک افواج کے بنیادی جذبے کی علامت کے طور پر پیش کی ہیں۔ ان مثالوں کی فہرست بہت ہی طویل ہے۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے بھارت کے اکیس (21) ڈویژنوں کو سات ڈویژنوں سے روکا تھا۔ یہاں میں ایک بات واضح کردوں___ ڈویژنوں کے حساب سے ہماری فوج انڈین آرمی کا تیسرا حصہ تھی۔ لیکن بھارت کے ڈویژن کی نفری پاک فوج کے ڈویژن کی نفری سے ڈیڑھ پونے دوگنا زیادہ ہوتی ہے اس حساب سے پاک فوج کی نفری انڈین آرمی کا چھٹا حصہ تھی لیکن بعض محاذوں پر ہمارے ایک سپاہی کا مقابلہ دس بھارتی سپاہیوں سے اور ایک ٹینک کا مقابلہ بارہ سے سولہ ٹینکوں تک تھا۔

اس فوقیت کے علاوہ انڈین آرمی نے اچانک حملہ کرکے پاک فوج کو تمام تر جنگی فوائد سے محروم کردیا تھا میدانِ جنگ میں اُس فوج کی فتح یقینی ہوتی ہے جو زیادہ سے زیادہ قوت سے رات کے پچھلے پہر کی تاریکی میں حریف کو بیدار کئے بغیر اچانک حملہ کردے اور اُسے مورچہ بند ہونے کی مہلت نہ دے اور اُسے کوئی چال سوچنے یعنی Initiative سے محروم کردے۔ پہلے روز انڈین آرمی نے پاک فوج کو اِسی ہولناک پوزیشن میں ڈال دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بھارت کے ففتھ کالم نے پاکستان کے شہریوں خصوصاً لاہور والوں کا حوصلہ اور پاک فوج پر اعتماد توڑنے کے لئے دو کاری ضربیں لگائیں۔ ایک یہ کہ بی بی سی اور وائس آف امریکہ سے اعلان کرادیا کہ انڈین آرمی لاہور پر قابض ہوگئی ہے اور دوسری افواہ یہ پھیلائی کہ ''لاہور کے ڈویژن کمانڈر میجر جنرل سرفراز کو گولی ماردی گئی ہے کیونکہ جب حملہ ہوا تو وہ شراب میں بدمست پڑا تھا۔'' (حالانکہ جنرل سرفراز کو لاہور کے کامیاب دفاع کے صلے میں ہلالِ جرأت دیا گیا)۔ مقصد اس سے یہی تھا کہ فوج کی دیوار کے پیچھے اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے والے شہری محسوس کرلیں کہ ان کی وہ حفاظتی دیوار ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔

جنگ کا کوئی بھی ماہر اور مبصر تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ پاک فوج کے مختصر سے دستے انڈین آرمی کی یلغار کو روک لیں گے۔ قوت کی زیادتی کے علاوہ وہ دیکھ رہے تھے کہ جنرل چوہدری نے پاک فوج کو تمام تر جنگی فوائد سے محروم کردیا ہے لیکن یہ ماہرین اور مبصر آج بھی سوچ رہے ہیں کہ پاک فوج نے یہ معجزہ کس طرح کر دکھایا؟

جب پاک فوج نے بھارت کے جنگ پسندوں کو لاہور کی دہلیز پر روک لیا اور بھارتیوں کی لاشوں کے انبار لگادیئے۔ تو بھارت کے چوہدری نے دوسری چال چلی۔ اُس نے محاذ کو پھیلانا شروع کردیا اور محاذ ایک ہزار میل تک پھیل گیا۔ انڈین آرمی پاکستان کی دفاعی لائن میں شگاف ڈالنا چاہتی تھی۔ وہ قوت کے زور سے اس مقصد میں کامیاب نہ ہوسکی۔ آخر اُس نے پاک فوج کو ایک ہزار میل لمبے محاذ پر

پھیلا کر مقصد پا لیا۔ کیونکہ پاک فوج کی نفری اس قدر طویل محاذ کے لئے تھوڑی تھی۔ چنانچہ دفاعی لائن میں از خود شگاف پیدا ہو گئے۔ ہمارا دفاع جو پہلے روز ایک موٹے رسے کی طرح مضبوط تھا، کھینچتے کھینچتے کچا دھاگہ بن گیا۔ پاکستان کا مستقبل اب اس کچے دھاگے سے لٹک رہا تھا۔

دفاع کی مضبوطی کو اس کی گہرائی سے ناپا جاتا ہے۔ اگلے مورچے، پچھلے مورچے اور اس سے پیچھے کمک سپلائی کا نظام۔ مثلاً دوسری جنگِ عظیم میں جب جرمنی نے روس پر حملہ کیا تھا تو روس کے دفاع کی گہرائی ایک سو پچاس میل تھی۔ لیکن جرمن فوجوں نے محاذ کو پھیلا کر روسیوں کے دفاع کی دوسری اور تیسری تہہ کو بھی اگلے مورچوں پر آجانے پر مجبور کر دیا تھا اور دفاعی گہرائی ختم کر کے جرمن فوجیں ماسکو تک جا پہنچیں تھیں یہی چال چوہدری نے چلی۔

جنرل چوہدری نے پاکستان کو فتح کرنے کی جو سکیم بنائی تھی وہ کسی پہلو بے عیب نہیں تھی۔ میں اس کی ایک چال کی داد دیتا ہوں کہ اُس نے پاکستان کے ٹینکوں کو ایک ہزار میل لمبے محاذ پر پھیل جانے پر مجبور کر دیا اور اپنے ٹینکوں (نمبر 1 آرمرڈ ڈویژن جس میں دو ٹینک رجمنٹیں، نمبر 62 کیولری اور 2 لانسرز اضافی تھیں) کو ایک جگہ مرکوز کر لیا اور سیالکوٹ سیکٹر پر جنگوں کی تاریخ کا شدید ترین بکتر بند حملہ کر دیا۔ اس بکتر بند قوت کے ساتھ اس کے انفنٹری (نمبر 26، نمبر 14) اور ایک مونٹین ڈویژن، نمبر 6 (جس میں جنگ سے چند دن پہلے تک امریکی افسر موجود تھے) بھی تھے۔ جب اس ہیبت ناک قوت نے سیالکوٹ پر یلغار کی تو پاک فوج کو کئی محاذوں سے ٹینک نکال کر سیالکوٹ کے دفاع کے لئے بھیجنے پڑے۔ اس دوران پاک فوج کے دو انفنٹری بریگیڈوں (یعنی پیادہ انسانوں) نے دشمن کے ٹینکوں کو اپنی چھاتیوں پر روکے رکھا۔ اور جان کے نذرانے دیتے رہے۔ سیالکوٹ سیکٹر میں (اور ہر محاذ پر) پاکستان کی دفاعی لائن کی کوئی گہرائی تھی ہی نہیں۔ نہ پچھلے مورچے تھے، نہ اس سے پچھلے اگر ہمارے اگلے مورچے اکھڑ جاتے تو پیچھے کوئی بھی نہیں تھا جو دشمن کو روکتا۔

کھیم کرن سیکٹر میں ٹینک رجمنٹ کے ایک رسالدار نے مجھے بتایا کہ بھارتی توپ خانے کے گولے ہمارے اگلے دستوں سے دور پیچھے گر رہے تھے کیونکہ دشمن ہماری سیکنڈ لائن کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ گولے خلا میں ضائع ہو رہے تھے، ہماری سیکنڈ لائن تھی ہی نہیں۔ میدان جنگ میں دوسری اور تیسری لائن انتہائی ضروری ہوتی ہے ورنہ شکست لازمی ہوتی ہے۔

جنرل چوہدری کی اسکیم بے عیب نہیں تھی۔ وہ پاک فوج کو اسی پوزیشن میں لانا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے جنگ کی اسکیم تیار کرتے وقت اپنی بے پناہ قوت اور پاک فوج اور فضائیہ کی ذرا جتنی نفری ہی کو سامنے رکھا تھا۔ وہ دو باتیں بھول گیا تھا۔ ایک یہ کہ پاک فوج اور فضائیہ بھی لڑنا جانتی ہے اور دوسری ضروری بات جو اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی، یہ تھی کہ پاکستان کی دفاعی لائن کے اگلے مورچوں پر تو پاک فوج ہے لیکن پچھلے مورچوں میں دس کروڑ پاکستانی شہری ہیں ___ دس کروڑ مردانِ حُر، مائیں، بہنیں اور بیٹیاں ___ جنرل چوہدری بریگیڈوں اور ڈویژنوں کے حساب سے قوت کا اندازہ لگاتا رہا لیکن اُس قطعاً کو خیال نہ

رہا کہ پاک فوج کا ہر ایک سپاہی اپنی جگہ مکمل قوت ہے۔ میدانِ جنگ میں قوت کو یونٹوں سے ناپا جاتا ہے، لیکن پاک فوج کی ہر اکائی اپنی جگہ کُل تھی۔ اُدھر ساز وسامان اور ڈویژنوں کا لشکر تھا، اِدھر انفرادی جذبہ تھا۔ یہ جنگ دراصل مورال اور میٹیریئل کی تھی۔ پاک فوج کے جذبے کو دس کروڑ شہریوں کی قوت حاصل تھی۔

یہ تجزیہ کچھ لمبا ہوتا چلا جارہا ہے میں سینکڑوں، ہزاروں میں سے صرف دو تین مثالیں پیش کرتا ہوں جس سے واضح ہوجائے گا کہ پوری قوم کی قوت اگلے مورچوں تک کس طرح پہنچی تھی۔ میں خود حیران تھا کہ آخر وہ جذبہ کتنا قوی تھا جس کے زور پر انسانوں کے جسموں نے ٹینکوں کو روک کر بھسم کر ڈالا، اور ایک ساتھی کی لاش دیکھ کر ڈرنے کی بجائے ہمارے جیالے جانباز جذبۂ شہادت سے سرشار ہوگئے اور ایک دوسرے کے پیچھے شہید اور شدید زخمی ہوتے چلے گئے۔ میں گزشتہ دو برس سے فوج کے افسروں اور سپاہیوں سے مل رہا ہوں اور ان سے پوچھتا پھر رہا ہوں کہ مجھ پر وہ جذبہ واضح کریں۔ مجھے کئی طرح کے جواب ملے جن میں دو تین آپ بھی سن لیجئے۔

نارووال سیکٹر کے ایک توپچی سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اُس سے لوئیس کرار والا سوال پوچھا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اَن پڑھ سپاہی ہے۔ فلسفی یا ماہر نفسیات نہیں۔ اُس نے ایک واقعہ سنا کر اپنے جذبے کی وضاحت کی۔ کہنے لگا کہ وہ بڑی گن (دوسو پونڈر) کا توپچی ہے۔ یہ گنیں بہت پیچھے نصب ہوتی ہیں۔ جس طرح لاہور کی رانی شہر سے فائر کرتی رہی تھی۔ اس توپچی کی توپ نارووال سیکٹر کے کسی گاؤں سے دو اڑھائی فرلانگ دُور نصب تھی۔ ایک روز پاکستان کی ایک جواں سال دیہاتی بیٹی، سر پر چنگیر اور سالن کا پیالہ اُٹھائے اس توپ کے پاس جا پہنچی اور بولی ___ ''ویرو! لو روٹی کھالو'' ___ اس توپ پر چھ سات توپچی تھے۔ گن کسی ٹارگٹ پر فائر کررہی تھی۔

ذرا سی دیر بعد فائر روکنے کا حکم مل گیا۔ ان توپچیوں نے اس عورت سے کہا کہ بہن! ہمیں راشن مل جاتا ہے، تم آئندہ یہاں نہ آنا۔ کوئی پتہ نہیں ہم پر کس وقت ہوائی حملہ ہوجائے۔ لیکن وہ بہن یوں چپ رہی جیسے اُسے دکھ ہوا ہو کہ اُسے توپ کے قریب جانے سے روکا گیا ہے۔ توپچیوں نے کھانا کھالیا۔ اس توپچی نے مجھے بتایا کہ میں نے ازراہِ مذاق اپنے ساتھی سے کہا ___ کہ ''یار! لسی پیئے عرصہ ہوگیا ہے۔''

انہوں نے کھانا کھالیا اور وہ بہن چلی گئی۔ کوئی نصف گھنٹہ بعد شاید دشمن کے ہوائی دیدبان Air O.P نے اس توپ کی پوزیشن دیکھ لی اور اپنے توپ خانے کو نشاندہی کردی۔ چنانچہ اس ایک توپ پر دشمن کے توپ خانے کی گولہ باری شروع ہوگئی۔ یہ گولہ باری کوئی ایک میل کے علاقے کو زد میں لئے ہوئے تھی۔ ہر سُو گرد اور سیاہ دھواں پھیل گیا اور دھماکوں سے زمین وآسمان لرزنے لگے۔

توپچی نے مجھے بتایا کہ میں نے جانے کیوں پیچھے دیکھا تو مجھے گرد وغبار میں کوئی آدمی جھاڑیوں کی اوٹ میں رینگتا دکھائی دیا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ وہ کسی دوسری توپ یا کسی انفنٹری کا سپاہی ہوگا لیکن میں نے دیکھا کہ اس کے کپڑے خاکی نہیں تھے۔ ذرا ہی دیر میں مَیں نے پہچان لیا کہ وہ آدمی نہیں کوئی عورت تھی۔ جو گولوں سے بچنے کے لئے پیٹ کے بل رینگ رہی تھی۔ میں بھاگ کر پہنچا۔ میں اُسے

پناہ میں لے لینا چاہتا تھا۔ قریب جا کر دیکھا تو میں حیران رہ گیا کیونکہ یہ وہی عورت تھی جو ہمیں کھانا کھلا کر گئی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں لسی سے بھری ہوئی مٹی کی ڈولی تھی جسے وہ آگے دھکیلتی تھی اور رینگتی تھی، پھر اُسے دھکیلتی اور رینگتی تھی۔ وہ برستی آگ میں ہمارے لئے لسی لا رہی تھی ___ مجھے یاد آیا کہ میں نے ہی مذاق میں کہہ دیا تھا کہ لسی پیئے عرصہ ہو گیا ہے۔

تو پچی بتاتا ہے کہ میں نے بڑے غصے سے اُسے کہا: ''پاگل! یہیں لیٹی رہو'' ___ اور میں خود اُس کے سامنے بیٹھ گیا تاکہ سامنے سے جو گولہ آئے وہ مجھے لگے، یہ بہن محفوظ رہے۔

اس تو پچی نے پُرعزم لہجے میں کہا ___ ''آپ ہی بتائیے صاحب! ہم ان بہنوں کے نام پر کیوں نہ کٹ مرتے؟''

کھیم کرن قصور محور کے ایک حوالدار نے سنایا کہ پہلے روز ہماری پلٹن ڈیپلائے ہو کر میدانِ جنگ میں پہنچی تو میں اپنی پلاٹون کے ساتھ ایک گاؤں کے قریب سے گزرا۔ گاؤں کے لوگ باہر کھڑے تھے، ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ انہوں نے نعرے لگائے۔ بعض نے ہم سے ہاتھ ملائے اور بڑوں نے ہماری پیٹھ تھپکائی۔ عورتوں نے دوپٹے پھیلا کر ہماری سلامتی کی دعائیں مانگیں۔ مجھے کسی عورت کی آواز سنائی دی جو کہہ رہی تھی ___ ''ویرو! تہاڈی جیہڑی کنڈا ساں دیکھی اے، اوہ ویری نہ دیکھے'' ___ ''بھائیو! تمہاری جو پیٹھ ہم نے دیکھی ہے وہ دشمن نہ دیکھے۔''

حوالدار سناتا ہے کہ گاؤں سے ذرا آگے چند جوان جوان لڑکیاں کھڑی تھیں۔ جب ہمارے سپاہی اُن کے قریب سے گزرے تو تین چار لڑکیوں نے اپنے ڈوپٹے اتار کر سپاہیوں پر پھینک دیئے اور ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر اپنا دوپٹہ ایک سپاہی کی پیٹھ پر باندھ دیا۔

''اللہ کی قسم!'' حوالدار نے کہا ___ ''پھر کچھ یاد نہ رہا کہ ہمارا مقابلہ ٹینکوں سے ہے یا توپوں سے۔ نہ یہ یاد رہا کہ دشمن کی نفری کتنی زیادہ اور ہم کتنے تھوڑے ہیں۔ ہم نے اپنی بیٹیوں اور بہنوں کے دوپٹے کھیم کرن سے آگے پہنچا دیئے۔ ان میں سے میرے دو سپاہی شہید ہوئے تھے۔ میں نے ان کی لاشیں دیکھیں، دونوں نے اُن لڑکیوں کے دوپٹے اپنی فولادی ٹوپیوں پر لپیٹے ہوئے تھے۔''

ان دوپٹوں کا کرشمہ معمولی نہیں۔ ذرا یہ بھی سن لیجئے کہ کھیم کرن قصور سیکٹر میں دشمن کی قوت کیا تھی ___ ایک مونٹین ڈویژن (نمبر 4) ایک مونٹین بریگیڈ (نمبر 41) اور (نمبر 2) انڈی پنڈنٹ آرمرڈ (بکتر بند) بریگیڈ گروپ جس کی نفری ڈویژن جتنی تھی۔ یہ ٹینکوں کا گروپ تھا۔ ان کی پشت پناہی کے لئے دو توپ خانے بریگیڈ تھے ایک ہیوی (Heavy) اور ایک میڈیم ہیوی۔ اس ہیبت ناک قوت کے اوپر انڈین ایئر فورس کے طیاروں کا آتشیں چھاتہ تھا ___ کھیم کرن کے دفاعی مورچے چھمب اور جوڑیاں کی طرح لوہے اور سیمنٹ کے بنکر تھے۔ (ایک غیر ملکی وقائع نگار نے کھیم کرن کی فتح کے بعد ان بنکروں کو دیکھ کر کہا تھا ___ ''جو فوج ان مضبوط مورچوں سے بھاگ گئی ہے وہ فوج کہلانے کی مستحق نہیں۔'')

اس ہیبت ناک قوت کو ہمارے صرف ایک پیادہ بریگیڈ اور دو ٹینک یونٹوں نے شکست دے کر کھیم کرن فتح کیا تھا۔ حملے کے دوران ان ٹینک یونٹوں کے چوبیس ٹینک یہاں سے ہٹا کر سیالکوٹ سیکٹر میں بھیج دیئے گئے تھے۔ یعنی

اپنی قوت اور زیادہ کم ہوگئی تھی۔

کھیم کرن کی فتح میں ایک اور شہری قوت کارفرما تھی۔ وہ تھے ''معاشرے کے خطرناک ترین انسان۔''___ قیدی قاتل اور ڈاکو جو لاہور جیل میں لمبی لمبی سزائیں بھگت رہے تھے___ کھیم کرن کے راستے میں چھوٹی چھوٹی نہریں اور ''کٹھے'' تھے جو گولہ باری سے ٹوٹ کر دلدل پھیلا رہے تھے۔ اس سے پیش قدمی رُک رہی تھی رات کے وقت دو دو اور تین تین سو قیدی کسی پہرے کے بغیر جیل سے نکل کر میدانِ جنگ میں آجاتے تھے۔ اور وہ نہروں اور کٹھوں کے ٹوٹے ہوئے کنارے مرمت کرتے تھے۔ ان کے لئے طویل قید سے بھاگ جانے کا یہ بڑا اچھا موقعہ تھا۔ لیکن مجھے پتہ چلا ہے کہ بعض اوقات ان قیدیوں پر گولہ باری ہونے لگتی تھی تو فوج کے کمانڈر انہیں پیچھے چلے جانے کو کہتے تھے لیکن قیدی ہر بار یہی جواب دیتے تھے کہ تم اپنا کام کرو اور ہمیں اپنا کام کرنے دو۔ اس گولہ باری میں ہمارا بھی حصہ ہے۔ ہمیں اپنے حصے کا خون بہا لینے دو۔

ایک رات تین سو قیدی میدانِ جنگ میں اسی کام میں مصروف تھے کہ قیامت کی گولہ باری ہونے لگی قیدی بے بس ہوکر بکھر گئے۔ صبح کے وقت تین سو قیدیوں میں سے ڈیڑھ سو قیدی اکٹھے کئے جاسکے۔ اور انہیں جیل میں واپس لے آئے۔ خیال تھا کہ باقی یا زخمی ہوگئے ہیں یا قید سے مفرور ہوگئے ہیں لیکن دن کے بارہ بجے تک جیل میں قیدیوں کی گنتی پوری ہوگئی۔ جو قیدی محاذ پر بکھر گئے تھے وہ فرداً فرداً اتنی دور سے پیدل چل کر واپس جیل میں آگئے۔ ان میں چند ایک زخمی بھی تھے۔

جنرل چوہدری جنگ کی اسکیم بناتے وقت پاکستان کی اس قوت کو بھول گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پچھلے مورچوں میں پاک فوج ہوگی___ لیکن وہاں دس کروڑ شہری تھے جو پاک فوج کے لئے ایسی قوت بن گئے تھے اگر انڈین آرمی کے اکیس ڈویژن پاکستان کی سرحد پر ذلت کی موت مر گئے___ اس فوج کو___ خدا کے اس ان گنت لشکر کو، نہ تو جنرل چوہدری کی آنکھ دیکھ سکی تھی اور نہ ہی ''ٹائم'' کے وقائع نگار کی نگاہ بھانپ سکی___ اور اس فوج کو دنیا کی کوئی قوت شکست نہیں دے سکتی۔

اسلام کے دشمن

''اسلام کے دشمن دانستہ، اور نادان دوست نادانستہ، ٹھنڈے سانس بھر کر کہہ رہے ہیں کہ اس دور میں قرآنی نظام ناقابلِ عمل ہے۔ تاریخ کے ایک دور میں تو اس نے شاندار نتائج پیدا کر دکھائے تھے۔ لیکن اب زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اب یہ ''چلا ہوا کارتوس'' کوئی نتیجہ مرتب نہیں کرسکتا۔ یہ آوازیں اِدھر اُدھر سے سنائی دے رہی ہیں اور عوام کے دلوں میں مایوسی پیدا کئے چلی جارہی ہیں۔ آپ احباب کی ذمہ داری ہے کہ زمانہ کو بتادیں کہ جو کچھ قرآن نے ایک دور میں کیا تھا اس میں آج بھی اس کی صلاحیت ہے اور ہمیشہ اس کی صلاحیت رہے گی کہ ویسے ہی درخشندہ نتائج پھر مرتب کر دکھائے۔'' (طلوعِ اسلام کنونشن، 1959ء)

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(قسط نمبر 18)

دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان

آزاد ارادی اعمال کی فلسفۂ اخلاق میں وضاحت:

آزاد ارادی اعمال کا خاصہ یہ ہے کہ وہ بغیر جبر و اکراہ منتخب ہوتے ہیں متعارض (conflicting) میلانات کا فیصلہ غور و فکر سے کیا جاتا ہے۔ ایک میلان کو اپنایا جاتا ہے اور دوسرے کو رد کر دیا جاتا ہے۔ میلانات کو اپنانے یا رد کرنے میں آزاد ارادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ فیصلہ کسی دباؤ کے زیر اثر نہیں ہوتا بلکہ تمام پہلوؤں پر سوچ بچار کے بعد کیا جاتا ہے۔ لہٰذا آزادی ءافعال کے تحت جو کام میں نے فی الواقع انجام دیئے ہیں اس نوعیت کے تھے کہ میرے لیے ان کا انجام نہ دینا ممکن تھا۔ اور اسی طرح بعض وہ افعال جو میں نہ کر سکا ایسے تھے جو مجھے انجام دینے چاہئیں تھے۔ لیکن اس صورت حال میں صاف ظاہر ہے کہ یہ کہنا کہ ''میں نے کام الف بالفعل انجام دیا، لیکن مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا'' کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ میں کام الف نہ کرنے پر قادر تھا۔ اسی طرح کام الف کا نہ کیا جانا۔ لیکن اس بارے میں مثبت اخلاقی صواب کا تصور اس امر کا متقاضی ہے کہ اس کا کرنا میرے بس میں تھا۔

فلسفہ اخلاق کے لیے انسان کے زیرِ تصرف آزادیِ ارادہ کا ہونا ایک لازم امر ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی شخص کو یہ بتانا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اسے اس کی بجائے دوسرا عمل انجام دینا چاہیے اس صورت میں بامعنی ہوسکتا ہے کہ اس شخص کے لیے دو متبادل میں سے لازمی طور پر انتخاب کا اختیار ہو۔

ہمارے لئے درج بالا بات تو ایک طے شدہ بات ہے لیکن اس ضمن میں بحث طلب امر یہ ہے کہ ارادی اعمال پر خیر و شر کا جو حکم صادر ہوتا ہے وہ اعمال سے پیدا شدہ نتائج کے لحاظ سے ہوتا ہے یا عامل کی اس ''غرض و غایت'' کی نیت کے اعتبار سے جس کی وجہ سے یہ عمل وقوع پذیر ہوا ہے؟ اس لیے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک کام کو بھلائی کی غرض سے کرتا ہے لیکن نتیجہ میں اس سے ایسی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں جس کا اس کو گمان تک نہیں ہوتا۔ اور اس کے برعکس کسی کام کو شر کی نیت

سے کرتا ہے مگر نتیجہ میں باعث خیر بن جاتا ہے۔

یہاں البتہ نتائج کے اعتبار سے بھی اعمال کا باہمی فرق ظاہر ہوتا ہے اور اس کے لیے مفید اور مضر کی اصطلاح وضع کی گئی ہے یعنی کسی عمل پر نتائج کے اعتبار سے یہ حکم لگانا صحیح ہے کہ یہ مفید ہے اور یہ مضر، کیونکہ مفید اور مضر، خیر اور شر کے ہم معنی نہیں ہیں۔ اس لیے کسی کے عمل پر مفید، مضر ہونے کا حکم اخلاقی حکم نہیں کہلاتا۔ بہر حال انسان کا ارادہ اگر نیک ہے تو وہ کسی ایسے عمل پر قابل ملامت نہیں ہے جس کا نتیجہ برا نکلے۔ البتہ وہ قابل ملامت اس لیے ہے کہ اس کی طاقت و استطاعت میں یہ تھا کہ وہ اس عمل کے نتیجہ پر غور کر لیتا، اور دِقت نظر اور باریک بینی سے کام لیتا تا کہ اس کو اس کے برے انجام کا حال معلوم ہو جاتا۔ مگر اس نے ایسا نہ کیا۔ تو یوں کہنا چاہیے کہ ملامت کا نشانہ، عمل خیر کا ارادہ یہاں نہیں بن سکتا بلکہ اس عمل کے اختیار کرنے میں جو کوتاہی ہوئی وہ نشانۂ ملامت ہے۔ اس بارے میں حق یہ ہے کہ کسی کام پر خیر یا شر کا حکم صادر کرنے کے لیے ''عامل کی غرض'' ہی کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ بس اگر عامل کی نیت اس کام میں خیر کی ہے تو نتیجہ کتنا ہی برا نکلے وہ کام خیر ہے اور اگر اس کی نیت بری ہے تو نتیجہ خواہ کتنا ہی بہتر ہو وہ کام برا ہے۔

حکمائے مغرب نے عصر حاضر میں آزادیِ ارادہ و اختیار کو ''نظریہ وجودیت'' میں نمایاں اہمیت دی ہے۔ نظریہ وجودیت کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی ہستی کی پہچان ہی اُس کے اُن تخلیقی اعمال کی بدولت ہے، جو وہ آزادیِ ارادہ سے انتخاب کر کے سرانجام دیتا ہے۔

عِلمی نظریہِ وجودیت میں آزادیِ ارادہ پر مبنی موضوعی ہستی کی اہمیت:

حقیقت یہ ہے کہ جبر و قدر کا مکمل حل محض علم الاخلاق ہی میں ملنا محال ہے۔ اس کے لیے مذہب مابعد الطبیعات (Metaphysics) اور طبیعی (Physical) علوم سے بھی مدد لینی ہوگی تب کہیں کوئی تسلی بخش حل ملنے کی امید ہو سکتی ہے۔

عِلمیات میں وجودی فلسفہ کا موضوع انسان گردانا جاتا ہے۔ انسان کا ایک تو معروضی مطالعہ ہوتا ہے جسے نفسیات، معاشیات وغیرہ کرتی ہے۔ اس مطالعہ میں انسان معروض (Object) بن جاتا ہے دوسرا انسان کا مطالعہ موضوعی ہوتا ہے اور وجودی اس دوسری قسم کے مطالعہ سے سروکار رکھتے ہیں۔ موضوعیت سے یہ مراد نہیں کہ انسان اپنے آپ میں مقید ہے۔ اس میں انسان کو آزاد، خود تخلیقی اور بلند منازل طے کرنے کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ خود تخلیقی سے بھی یہ مراد نہیں کہ انسان خود کو ان معنوں میں تخلیق کرتا ہے جن معنوں میں خدا انسان کو تخلیق کرتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو تخلیق کرتا ہے صرف ان معنوں میں کہ جو کچھ وہ بنتا ہے اپنی ہستی وہ اپنے ہاتھوں سے بناتا ہے۔

وجودی فلسفہ انسان کا تجزیہ، سائنسی نقطہ نگاہ سے نہیں کرتا بلکہ اس کا مقصد انسانی آزادی کو اجاگر کرنا ہوتا ہے تا کہ حقیقی انتخاب (Authentic Choice) کی گنجائش پیدا ہو۔ حقیقی انتخاب کی صلاحیت حاصل کرنا خود انسان کی اپنی ذات پر

منحصر ہوتا ہے۔

موضوعی مطالعہ کے تناظر میں وجودی فلسفہ کا مفکر مارسل کہتا ہے کہ میں کائنات میں صرف جسم سے شرکت نہیں کرتا۔ انسان ہونے کی وجہ سے میرا رشتہ دوسرے اشخاص سے ہے یہ رشتہ دو قسم کا ہوسکتا ہے۔

ایک رشتہ میں دوسروں کو صرف بطور شے لیا جاتا ہے۔ ان کو استعمال کیا جاتا ہے یا ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے وہ کہتا ہے اگر محبت صرف تسکینِ ہوس کے لیے ہو تو دوسرا شخص جسے ہوس پرستی کے لیے استعمال کیا جارہا ہے وہ صرف شے ہوجاتا ہے۔ انسان (Person) نہیں رہتا۔

ایک دوسرا رشتہ ہے I اور Thou (من وتو) کا جس میں دوسرا شخص انسان سمجھا جاتا ہے بعینہ ویسا جیسا میں خود ہوں۔ یہ رشتہ موضوعی ہے اس میں خودغرضی یا ہوس پرستی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ یہ انسانی رشتہ ہوتا ہے، دو انسانوں کے درمیان۔ یہ رشتہ محبت، وفاداری اور ایک دوسرے کے کام آنے کا ہوسکتا ہے۔ یہ رشتہ دوسری سوچ پر ابھرتا ہے۔ اس سطح پر مَیں ''ہیئت'' (Being) میں ذاتی طور پر آزادیِ ارادہ سے موضوعی رابطہ سے شرکت کرتا ہوں۔

نظریہ وجودیت کے مطابق افراد اپنی ذات کو آزاد اور امکانات کا مجموعہ سمجھ کر اس فکر میں رہتے ہیں کہ امکانات کو حقیقت میں تبدیل کریں اور جو صلاحتیں ان کی ذات میں مضمر ہیں انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔ لہٰذا افراد کی اخلاقی زندگی میں اعمال کی حیثیت بہت نمایاں ہوتی ہے۔ ان میں لیکن اعمال کا تعلق ماحول سے نہیں بلکہ وجود کی تکمیل کے ساتھ ہوتا ہے۔

اس نظریہ کی وضاحت میں وہ کہتے ہیں کہ میرے متعلق کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ''میں یہ ہوں'' کیونکہ میں اپنی ہیئت کا امکان ہوں۔ میں مکمل نہیں بلکہ ہر لحظہ اپنی تخلیق اور انتخاب کے ذریعے تحصیل ذات میں لگا رہتا ہوں۔ اس کا علم بھی مجھے ذاتی تجربہ سے حاصل ہوسکتا ہے۔

نظریہ آزادیِ ارادہ البتہ سائنس کی گرفت میں نہیں آتا، لہٰذا اسے ثابت یا رد نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا تجربہ ہمیں انتخاب کے موقعہ پر ہی ہوتا ہے جس میں پوری ذمہ داری سے متبادل میں انتخاب کر کے اپنی خود تخلیق کرتا ہوں۔ ایک وجودی فلسفی دوسروں کی توجہ تو اپنی طرف مبذول کرا سکتا ہے لیکن جس سچائی پر انسان پہنچتا ہے وہ اس کی اپنی سچائی ہے جسے اس نے ذاتی انتخاب اور مستقل عزم سے حاصل کیا ہوتا ہے۔

اس موقعہ پر کیرکیگارڈ ایک وجودی سفر متعارف کراتا ہے، جس میں انسان ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بغیر کسی جبر کے خود انتخاب سے آگے بڑھتا ہے۔

اس وجودی سفر میں پہلی منزل وہ تحساتی منزل کی گنواتا ہے۔ اس منزل پر کوئی اخلاقی اصول یا ضابطہ نہیں ہوتا۔ اس منزل میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو اصولوں سے سخت نفرت کرتے ہیں اور ہر قسم کا عیش چاہتے ہیں۔ یہ لوگ انتخاب اور عزم سے عاری

ہوتے ہیں اور جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارتے ہیں۔

دوسری منزل اخلاقی منزل ہے۔اس میں انسان اپنے آپ کو کسی عالمگیر اور حتمی اخلاقی اصول کے تحت لے آتا ہے اور اپنے آپ کو خود اپنے انتخاب سے اخلاقی اصول کا پابند بنالیتا ہے۔لیکن کیر کی گارڈ کے مطابق اخلاق کا مقصد انسان کو عارضی خوشی ہی مہیا کرنا ہوتا ہے۔

تیسری منزل دینی کہلاتی ہے اور اس میں انسان اخلاقی اصولوں کا پابند نہیں ہوتا۔وہ خدائے برتر کی صفات سے قُرب پیدا کر کے اس سے رشتہ قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کامیاب ہونے کی صورت میں صحیح معنوں میں ایک آئیڈیل فرد بنتا ہے۔

وجودی ارتقاء ہیگل کے فکری ارتقاء سے مختلف ہے۔فکری ارتقاء میں ایک لزومت ہے ایک ترکیب سے دوسری ترکیب جنم لیتی ہے اور اس کی تہہ میں منطقی لزومت کام کرتی ہے۔وجودی ارتقا میں کوئی جبر نہیں۔یہاں یہ ضروری نہیں کہ ارتقاء ایک ہی طرح سے ہو یا ایک منزل کے بعد دوسری منزل آئے۔ہر منزل انسان کو خود انتخاب کرنی پڑتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وجودی ارتقا کی تہہ میں کوئی حکمت نہیں۔وجود امکانات (potentiality) کا مجموعہ ہے ان کو واقعیت (Actuality) میں لا کر ہی صحیح معنوں میں انسان Authentic بنتا ہے۔

مادی/ میکانکی نظریہ حیات کے عملی پہلو میں آزادیِ ارادہ کی اہمیت:

میکانکی نظریہ اور انسانی آزادی دو متضاد تصورات ہیں۔حکمائے مغرب کے میکانکی تصور حیات کی رو سے انسان ایک بے بس مشین بن کر رہ جاتا ہے اس میں اپنا اختیار وارادہ (Free will) ہوتا ہی نہیں۔سو جب انسان صاحب احتیار وارادہ ہی نہیں تو اخلاقیات (Ethics) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ہم دیکھ رہے ہیں کہ جبریت کے باوجود میکانکی نظریہ حیات کے حکماء مغرب انسان کو اس کے افعال کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں یعنی یہ نظری طور پر تو انسان کو مجبور محض (ایک مشین) لیکن عملی دنیا میں انسان کو صاحب اختیار وارادہ مانتے ہیں۔اس لیے کہ عملی دنیا میں کوئی کام چل ہی نہیں سکتا جب تک انسان اپنے افعال کا ذمہ دار قرار نہ پائے۔ڈیکارٹ کے الفاظ میں سوائے انسان اپنی روح (ذات) کے علاوہ ہر چیز پر طبیعات کے اصولوں کی پابند ہے۔

انسانی معاشرہ کے نظم ونسق اور ربط وضبط کا تمام سلسلہ اسی شیرازہ سے منسلک ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس نظریہ کے حاملین کو عملی دنیا میں انسان کو صاحب اختیار وارادہ تسلیم کرنا پڑتا ہے حالانکہ اس سے ان کی نظری/عقلی تحقیقات کی تمام عمارت دھڑام سے نیچے گر پڑتی ہے۔حکمائے مغرب نے انسانی معاشرہ کے لیے اخلاقیات کا معیار صرف عقلِ انسانی کو قرار دیا اور ان کا یہ دعویٰ ہے کہ عقلِ انسانی میکانکی قوانین علت ومعلول کی پیدا کردہ ہے۔ظاہر ہے کہ جو چیز مشین کی پیدا کردہ ہو وہ اس قابل ہو ہی نہیں سکتی کہ معاملات کا آزادانہ فیصلہ کر سکے۔

ماہر نفسیات جی ایف سٹاؤٹ نے آزادیِ ارادہ کی وضاحت خود فیصلہ لینے کی قوت رکھنے سے کیا ہے۔وہ ایک ایسے شخص کو فرض کرتے ہوئے کی ہے جو اس بات کا فیصلہ کرنے میں مصروف ہے کہ دو ممکن غایتوں میں سے وہ کس کو اختیار

کرے۔ظاہر ہے ابھی اس کو اپنا عمل طے شدہ معلوم نہ ہوگا کیونکہ اس کا انحصار تو اس کے فیصلے پر ہے اور اس بات کا ابھی تصفیہ نہیں ہوا کہ وہ کیا فیصلہ کرے گا۔لیکن ایک آدمی یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کا اچھا فیصلہ کیا ہونے والا ہے انتظار نہیں کرسکتا۔کیونکہ یہ فیصلہ تو اسے خود کرنا ہے۔اسے فیصلہ لینے میں کسی خارجی مدد کی شکل میں ضروری معطیات دستیاب نہیں ہوتے۔وہ اپنا اندازہ محرکات کی اضافی قوت کی بنا پر بھی قائم نہیں کرسکتا، کیونکہ محرکات کی اضافی قوت ایسی بنی بنائی اور تیار شے نہیں ہوتی کہ دورانِ تدبر اور فیصلے کے لمحے میں غیر متغیر رہے۔اس لیے یہاں پر وزن کرنے یا تولنے کا استعارہ بھی لاگو نہیں ہوتا۔تصفیہ کرنے کے دوران محرک قوی و کمزور ہوتے جاتے ہیں اور جو شخص اپنے دل میں تصفیہ کرتا ہے وہ پہلے سے اس بات کی پیشین گوئی نہیں کرسکتا کہ کون سے محرک کو اتنا غلبہ حاصل ہوجائے گا کہ اس کے فیصلے کے محرک بن جائیں گے۔یہ بات وہ اس وقت تک نہیں جان سکتا جب تک واقعی طور پر فیصلہ نہیں ہوچکتا۔اس سے پہلے یہ دعویٰ کہ کوئی ایک محرک یا مجموعہ محرکات اتنا قوی ہے کہ اس کی پسند کا تعین کرسکتا ہے، اس بات کے مترادف ہے کہ وہ پسند کرنے میں مصروف ہے ہی نہیں۔بالفاظ دیگر یہ اس کے ارادے کے آزاد ہونے سے انکار کے مترادف ہے۔

لہٰذا اختیار کے معنی خود فیصلہ کرنے کی قوت کے ہیں کیونکہ میرا آئندہ فیصلہ اس وقت تک غیر متعین ہے جب تک یہ ہو نہ جائے کیونکہ یہ مجھے خود کرنا ہے۔آزادی ارادہ یا اختیار کے تصور کے لیے نفسیاتی طور پر کم از کم اتنا تو ضروری ہے تاکہ کوئی معقول شبہ کا جواز نہ رہے کہ ہم صاحب اختیار ہیں۔

فلسفہ اخلاق میں مستند ترین اتھارٹی ایمونیئل کانٹ نے آزادیِ اعمال میں عزم و استحکام پر مبنی آزادیِ ارادہ کو اخلاقی امور کی بطورِ فرض ادائیگی کرنے کی بنیاد پر اپنا موقف بیان کیا ہے کہ انسان کے لئے خیر (Good) وہ ہے جسے ایک صاحب عقل و ارادہ جذبات پر پورا پورا اقتدار رکھتے ہوئے لازمی طور پر اختیار کرے گا اور شر وہ ہے، جس سے اس قسم کا ارادہ لازمی طور پر مجتنب رہے گا۔

کانٹ کے اخلاقی قانون میں آزادیِ ارادہ کی وضاحت:

اِس امر کی وضاحت کرنے سے پیشتر یہ جان لینا ضروری ہے کہ فرض کے تصور کو جب بھی قابل اعتنا سمجھا جاتا ہے تو اس کا لازمی مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اعمال جو میں نے فی الواقعہ انجام دئے ہیں اس نوعیت کے تھے کہ میرے لیے ان کا انجام نہ دینا ممکن تھا۔اسی طرح وہ اعمال جو میں نہ کرسکا ایسے تھے جو مجھے انجام دینے چاہیے تھے۔یہاں صاف ظاہر ہے کہ یہ کہنا کہ ''میں نے کام الف بالفعل انجام دیا لیکن مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا''، کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ میں کام الف کے نہ کرنے پر قادر تھا۔اسی طرح کام الف کا نہ کیا جانا کہ مَیں کام الف کرنے پر قادر تھا۔

کانٹ کے نزدیک اخلاقی قانون ہماری خواہش کا تابع نہیں بلکہ یہ تو ایک ایسا قانون ہے جس کے تحت ہم لوگ خود ہی اس بات کے اخلاقی طور پر پابند ہوتے ہیں کہ ہم کو کیا ارادہ باندھنا ہے اور کیا ترک کرنا ہے۔جب ہم یہ کہتے ہیں

کہ ''ہمیں یہ کرنا چاہیے'' تو اس قول سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ گویا ''ہم یہ کر سکتے ہیں'' اور ''یہ نہیں کر سکتے ہیں''۔ دونوں صورتوں میں عملدرآمد کرنا ہماری صوابدید پر منحصر ہے۔ اگر حکم اطلاقی، کسی اخلاقی حکم کی بجا آوری کی جانب فرد کو مائل رکھتا ہے تو پھر یہ بات بھی ضروری ہے کہ فرد میں اس اخلاقی حکم کو بجالانے کی صلاحیت موجود ہے۔ اور اگر کسی بات کو کر گزرنے کی استطاعت فرد کے اندر موجود ہی نہ ہو تو پھر یہ بات بھی طے ہے کہ وہ اخلاقی حکم، اخلاقی حکم ہی نہیں جس کی بجا آوری پر فرد قدرت ہی نہ رکھتا ہو۔ اِسی قدرت رکھنے کی بِنا پر کانٹ آزادیِ ارادہ کے تحت افعال کے بر بنائے اصول کئے جانے پر زور دیتا ہے۔

افعال بر بنائے اصول/فرض:

یہ افعال بر بنائے جذبہ کے برخلاف ایک واضح اور عمومی اصول پر مبنی ہوتے ہیں کانٹ کا کہنا یہ ہے کہ کوئی فعل اخلاقی طور پر صائب اور راست نہیں ہوسکتا، جب تک کہ وہ کسی عمومی اصول کے تحت انجام نہ دیا گیا ہو، اور یہ عمومی اصول فاعل کی ذات کو شعوری طور پر قبول نہ ہو۔ اسے حکم مطلق بھی کہتے ہیں اور حکم مطلق دراصل وہ ہے جو اپنے ذاتی محاسن کی بنا پر قبول کیا گیا ہو کسی خارجی مقصد کے حصول کے لیے ایک ضابطے کے طور پر نہیں بلکہ اپنے تئیں مقصود بالذات ہو۔

اگر کوئی عمل ایک ایسے اصول پر مبنی ہے جو حکم مطلق ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ عمل برائے اصول یا بر بنائے فرض ہے۔ کائنات میں ہر شے قانون کے تابع سرگرم عمل ہے لیکن یہ خصوصیت صرف انسان (صاحب عقل) کو حاصل ہے کہ وہ قوانین کے تصوراتِ کے مطابق عمل کرتا ہے، یعنی اصولوں کی روح کے مطابق۔ اس کا مطلب یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اصولوں سے اعمال کا مستنبط کرنا عقلی ارادہ کا کام ہے۔ عقلی ارادہ کے کانٹ نزدیک معنی ہیں وہ قوت جس کی رو سے انسان کسی قانون کے تصور (اصول) کے مطابق کام کرنے کا تہیہ کرے۔ یعنی ایسے اعمال جو انسان کی اپنی جبلت کے تحت جذبات پر مبنی نہ ہوں بلکہ کسی عمومی اصول کے تحت انجام پائیں اور یہ اصول بھی فاعل کو شعوری/عقلی طور پر قبول ہو۔ کانٹ کے نزدیک ارادہ (will) کی تعریف ہی یہی ہے اور اِسی ضِمن میں نیک ارادہ سے مراد ہے کہ مستقل مزاجی کے ساتھ مسلسل اور داخلی کشمکش اور تصادم کے بغیر، وہ ارادہ جو کسی کام کو صرف اس لیے کرتا ہے کہ اس کا کرنا فرض (Duty) ہے۔ کانٹ نے اسی اصول مطلق یا امرِ غیر مشروط کو نیک عقلی ارادہ سے وابستہ کرتے ہوئے کچھ اصولوں کی نشاندہی کی ہے۔ جن کو کانٹ کے اصولِ اخلاقیات کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ تعداد میں تین ہیں۔

کانٹ کا پہلا اصول اخلاقی:

کانٹ کا پہلا اصول یہ ہے کہ:

Act on a principle to become a universal law

اس طرح عمل کر گویا تیرے عمل کا قانون تیری ہی مرضی سے عالمگیر قانون بن جائے۔

یعنی اصول عمل ایسا ہونا چاہیے جس کے بارے میں کوئی بھی ذی عقل انسان متوافق طور پر ارادہ کر سکے کہ اس پر تمام دوسرے انسان اپنے اور عالمگیر مفاد کے منافی نہ پاتے ہوئے عمل کر سکتے ہیں اور ایسا کرنا ہی فرض ہے۔

کانٹ کا دوسرا اصول اخلاق:

کانٹ کا دوسرا اصول یہ ہے کہ

Never treat Humanity as means but as an end

ہر انسان کی ذات کو فی نفسہ ایک غایت سمجھ اور کسی کو محض ایک ذریعہ نہ سمجھ۔

کانٹ کا دوسرا اصول بھی پہلے اصول کا حصہ ہے۔ ہر انسان کی ذات اپنی جگہ وہی اہمیت رکھتی ہے جو کسی دوسرے انسان کی لیکن ہم عام زندگی میں دوسرے کے مفاد کو پیشِ نظر نہ رکھتے ہوئے اُس کا استحصال کرتے ہوئے ایک ذریعہ کا درجہ دے کر اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں۔ یہ اخلاقی قانون کے دائرے میں نہیں آتا۔

کانٹ کا تیسرا اصولِ اخلاق:

کانٹ کا تیسرا اصول یہ ہے کہ:

Be a member of the kingdom of Ends

عالم مقاصد کے ایک رکن کی حیثیت سے عمل کر یعنی اخلاقی کردار کا کوئی اصول میرے لیے صرف اور صرف اسی صورت میں اخلاقی طور پر موزوں اور واجبیت رکھتا ہے جب میں اسے ایک ایسا قانون قرار دے سکوں جسے میں اپنے نیک ارادہ میں شامل پا کر اپنے اوپر عائد کرتا ہوں۔

یہ اصول پہلے دو اصولوں کا نتیجہ ہے۔ اگر انسان ایک عالمگیر اصول اخلاق پر عمل کرتے، دوسرے انسانوں کو اتنا ہی اہم جانیں جتنا خود کو، تو وہ عالم انسانیت کا ایک فرد بن جائے گا۔ کانٹ کے یہ اصول اپنے اندر معنویت رکھتا ہے۔ ان اصولوں پر اگر عمل کیا جائے تو اس میں انسانیت کا بھلا ہی مقصود ہوگا، خود غرضی، استحصال ختم ہوجائے گا گویا یہ بھی ایک مثالی (Ideal) صورت ہے۔ لیکن یہ مقاصد کیا ہیں جو قریبی اپنی فوری افادیت کے حصول کی پرواہ کئے بغیر عمل میں لائے جاتے ہیں؟

کانٹ کہتا ہے کہ یہ وہی اصول یا قوانین ہیں جن تک انسان عملی عقل کی رو سے پہنچتا ہے۔ وہ عقل جو جذبات سے ملوث نہ ہو۔ اس کا نام کانٹ کی اصطلاح میں قانون حریت (Law of Freedom) ہے یعنی وہ قانون جس کی رو سے ایک

صاحب عقل انسان اس وقت عمل کرتا ہے جب اس کی عقل اس کے جذبات ومیلانات پر پورا پورا اقتدار رکھتی ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں کانٹ کے نظریہ کی رو سے

" void of will Man is still better than angels,With all his failings"

انسان اپنی تمام تر ناکامیوں کے باوجود، آج بھی ان فرشتوں سے کہیں بہتر ہے جو ''ارادے'' سے عاری مخلوق ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان حرمت ووقار کی حامل ایک ہستی ہے جس کا تعلق ایک ایسی دنیا سے ہے جو مقاصد اور نصب العینی اقدار کی روشنی سے منور دنیا ہے۔ جس دنیا میں کہ وہ (انسان) بطور ایک مفید اور کارآمد شے کے طور پر، محض آلہ کار نہیں بنتا بلکہ یہ تو اپنی ذات میں ایک مقصد کلی ہے اور اسی ذات ہی سے اخلاقی قانون کا سرچشمہ پھوٹتا ہے لہذا انسان کے لئے خیر (Good) وہ ہے جسے ایک صاحب عقل وارادہ جذبات پر پورا پورا اقتدار رکھتے ہوئے لازمی طور پر اختیار کرے گا اور شر وہ ہے، جس سے اس قسم کا ارادہ لازمی طور پر مجتنب رہے گا۔

کانٹ لازمی شرط رکھتا ہے کہ وہی اصول قوانینِ حریت میں شمار کئے جاسکتے ہیں، جن تک انسان اُس عقلِ عملی کی رو سے پہنچتا ہے، جو جذبات میں ملوث نہ ہو۔

اس کے برعکس حکمائے مغرب اس بات پر متفق ہیں کہ عقل کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ جذبات سے متاثر نہ ہو۔ متاثر ہونا تو ایک طرف عقل کا تو فریضہ ہی جذبات کی لونڈی بن کر اُن کی تسکین کا سامان فراہم کرنا ہے۔ علامہ اقبال نے اِن جذبات کو عقلِ خود بین کا شاخسانہ قرار دیتے ہوئے حکمائے مغرب کی تنقید کی تائید کی، جب اُنہوں نے کہا کہ ؎

عقلِ خود بین غافل از بہبودِ غیر سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر

اُنہوں نے البتہ ساتھ ہی کانٹ کے موقف کا حل بھی وحی کی روشنی میں عقلِ جہاں بین کا تصور دے کر کہا کہ ؎

عقلِ جہاں بین بیندہ سود و بہبود ہمہ

کانٹ کے سامنے اگر وحی پر مبنی القرآن ہوتا، تو مجھے یقین ہے کہ وہ بھی عقلِ جہاں بین کے حوالہ سے بات کرتا لیکن عقلِ جہاں بین سے مِلتا جُلتا نام کانٹ نے اپنی خود ساختہ اصطلاح قانون حریت (Law of Freedom) کے حوالہ سے کر دیا۔ یعنی وہ قانون جس کی رو سے ایک صاحبِ عقل انسان اس وقت عمل کرتا ہے جب اس کی عقل اس کے جذبات ومیلانات پر پورا پورا اقتدار رکھتی ہو۔ نظریہ آزادیِ ارادہ کی نفی اور اثبات کے مؤقف کو ہمارے ہاں مسئلہ جبر وقدر کے تحت سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے، لہٰذا انسان کا اپنے ارادہ میں آزاد یا مجبور ہونے پر الگ الگ سیر حاصل گفتگو کرنے کے بعد آخر میں ضروری سمجھا جا رہا ہے کہ دونوں کے تناظر کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے یہاں مسئلہ جبر وقدر پر

قدرے تفصیل سے وضاحت کی جائے۔

نظریہ جبر وقدر کے مسائل:

اِس نظریہ کو ہم درجِ ذیل چار تین گوشوں سے زیرِ بحث لا کر وضاحت کرنے کی کوشش کریں گے۔

1۔ مسئلہ جبر وقدر میں عمومی نظریہ تقدیریت (Fatalism)

2۔ مسئلہ جبر قدر میں علم الکلام کے تحت ایک الٰہیاتی لاینحل مسئلہ

3۔ مسئلہ جبر وقدر میں نظریہ ارتقاء کا موقف۔

1۔ مسئلہ جبر وقدر میں عمومی نظریہ تقدیریت (Fatalism)

تقدیر (Fate) سے فلسفہ میں یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ وہ لازم، جو اشیاء کو اور واقعات کو اس پیرائے میں ظاہر کرتا ہو، جس میں وہ ظہور پذیر ہو رہے ہوں۔ لہٰذا تقدیریت سے مراد وہ عقیدہ ہے کہ جو ہونا ہے، ہوگا۔ کائنات میں جو ہوتا ہے اس کو بدلنے کی ہر ممکن کوشش ناکام ہوگی۔ کائنات قبل ازیں متعین کردہ قوتوں کے سامنے مجبورِ محض ہے۔

فلسفہ میں تقدیریت کا عقیدہ الٰہیات کے تناظر میں بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی رو سے اللہ تعالیٰ عالم کل اور قادر مطلق ہے اور اس کے علم اور قدرت کاملہ سے کائنات میں جو کچھ بھی ہوتا ہے لازماً اور وجوباً وقوع پذیر ہوتا ہے۔ جبریہ مفکرین اس بات کی نفی کرتے ہیں کہ انسان اپنے اعمال کا خالق ہے اور جو بھی فعل انسان سے سرزد ہوتا ہے اسے اللہ سے منسوب کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں الجبریہ خالص کے مطابق انسان سے نہ تو کسی قسم کا فعل سرزد ہوتا ہے اور نہ اسے کسی فعل کرنے کی قدرت ہوتی ہے۔

فلسفہ میں تقدیریت اس بات سے انکار نہیں کرتی کہ ہر وقوعہ کا ایک سبب ہوتا ہے۔ یہ صرف اس بات سے انکار کرتی ہے کہ انسان میں واقعات کو بدلنے کی طاقت ہے۔ ''جو کچھ ہونا ہے وہ ہوگا'' یہ تقدیریت کا نعرہ ہے۔ جو محض تجزیاتی بیان نہیں ہے۔ اس سے جو مقصود ہے وہ یہ کہ مستقبل ایک مخصوص طرز کا ہوگا خواہ ہم کچھ بھی کریں اور اس لیے ہمارا کچھ بھی کرنا بے سود ہے۔ مگر یہ نظریہ اُن لوگوں کو بھاتا ہے جو کچھ نہ کرنے کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ یہ تجربی حقائق کے بالکل خلاف ہے کہ ''جو ہوگا وہ ہوگا'' مگر کیا ہوگا اس میں انسانی اعمال کو بڑا دخل ہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ مستقبل کا دارومدار کم از کم ایک حد تک اس پر ہے کہ حال میں ہم کیا کرتے ہیں۔ اس موقف میں تقدیریت پسند اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ اعمال کے نتائج ہوتے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ انسانی ارادہ معذور ہے اور واقعات پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔ اب وہ اتنا کہتا ہے کہ ہم جو کچھ فیصلے کرتے ہیں، وہ پہلے سے متعین ہوتے ہیں اور ہم مقدر کے پابند ہیں۔ شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اعمال کے اسباب ہمارے فیصلے ہیں مگر ہمارے فیصلے (یعنی انتخاب) خود کچھ متعیّن اسباب کے نتائج ہیں۔ فرائیڈ اسے ان معنی میں نظریہ جبریت ہی کی محض

ایک قسم شمار کرتا ہے۔اس کے مطابق ذہنی زندگی کے تمام پہلو طبیعی حالات کی طرح سے منظم اور متعین ہوتے ہیں اور کوئی بھی واقعہ اتفاقی نہیں ہوتا۔

علامہ اقبال نے خطبات میں تقدیر پرستی کی مسلمانوں کی تاریخ کی روشنی میں وضاحت کی ہے کہ یہ تقدیر پرستی جس کو حکمائے مغرب لفظ قسمت سے ادا کرتے ہیں، کچھ تو نتیجہ تھی بعض فلسفیانہ افکار اور کچھ سیاسی مصلحت پسندیوں کا.....۔

لہٰذا کہا گیا کہ علت و معلول کا سلسلہ چونکہ بالآخر ذاتِ خداوندی پر ختم ہو جاتا ہے، اندریں صورت جو کچھ بھی ہو رہا ہے خدا ہی کے حکم سے ہو رہا ہے۔ یہ وجوہ تھے جن کی بنا پر علمائے اسلام کے کھلم کھلا احتجاج کے باوجود عالم اسلام نے ایک بڑی ذلت خیز تقدیر پرستی اختیار کر لی۔ پھر وہ دستوری نظریہ بھی جسے ''امر اتمام یافتہ'' (Accomplished fact) سے تعبیر کیا جاتا ہے تاکہ حقوق منزعومہ کی تائید کا جواز ہو جائے، بہت کچھ اس کا ذمہ دار ہے۔

اس اقتباس کی روشنی میں یہ قابل تعجب بات نہیں رہی کہ مسلمانوں میں ابھی تک یہ عقائد پائے جاتے ہیں کہ:

1۔دنیا میں ایک پتہ بھی خدا کے حکم کے بغیر نہیں ہل سکتا۔

2۔انسان خدا کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔

3۔یہاں جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔انسان اس میں دخل نہیں دے سکتا۔

4۔انسان کی زندگی میں جو کچھ ہونا ہوتا ہے، وہ سب، اس کی پیدائش سے پہلے ہی اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔

5۔خدا قادر مطلق ہے، وہ جو چاہے کرے کسی کو اس کے حکم کے سامنے مجال سرتابی نہیں۔

6۔وہ جسے چاہے بے حد حساب رزق دے، جسے چاہے تنگی دے۔جسے چاہے امیر بنا دے وہ جسے چاہے مفلس اور قلاش کر دے۔

7۔جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت دے۔وہ چاہے تو بادشاہوں سے بھیک منگا دے اور چاہے بھکاریوں کے سر پر تاج شاہی رکھ دے۔

8۔تندرستی اور بیماری موت اور زندگی سب اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔انسانی تدبیر اس میں کچھ نہیں کر سکتی۔

9۔انسان کو چاہیے کہ اس کی مرضی کے خلاف دل میں شکایت کا احساس تک پیدا نہ ہونے دے۔جو کچھ ہو، اس پر صابر و شاکر رہے۔

10۔جس قدر انسان راضی برضا رہے گا، اسی قدر اس کا شمار مقربین بارگاہ الٰہی میں ہوگا۔

سب کام اپنے کرنے تقدیر کے حوالے نزدیک عارفوں کے تدبیر ہے تو یہ ہے

(جاری ہے)

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مستقبل کے وزیراعظم کی وکٹری سپیچ

ایک عرصہ سے عمران خان صاحب کے متعلق یہ خبریں گردش کرتی رہی ہیں کہ ان کا مذہب کی طرف رجحان ہو رہا ہے۔ ابھی چند روز پیشتر ان کا ایک بیان بھی ایک چینل پر آیا تھا جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ انہیں معرفت کا سفر اختیار کئے ہوئے 30 سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ کافی عرصہ پیشتر ایک بہت مشہور عالم تھے ان کے درسِ قرآن اور تقاریر بہت عرصہ تک T.V چینل پر نشر ہوتی رہی ہیں۔ اخباری اطلاعات کے مطابق عمران خان صاحب کی ان کے ساتھ دس گھنٹہ کی ملاقات ہوئی لیکن عمران خان اس ملاقات میں مطمئن نہیں ہوئے۔ علماء کرام سے مطمئن نہ ہونے کے بعد ان کے پاس ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا تھا کہ وہ معرفت کے راستہ پر چل پڑیں جس کا قرآن میں کوئی حکم نہیں حتیٰ کہ معرفت کا لفظ ہی سارے قرآن میں کہیں استعمال نہیں ہوا۔ یہ بات عمران خان صاحب کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ جب کسی کے سامنے سب راستے بند ہو جاتے ہیں تو اس کے سامنے صرف ایک معرفت (تصوّف) کا راستہ کھلا رہ جاتا ہے اور وہ اسی پر گامزن ہو جاتا ہے۔ مغرب کے بیشمار دانشور، فلاسفرز اور سائنسدان آخری عمر میں صوفی بن گئے تھے۔ ہمارے ہاں ڈاکٹر محمد نذیر گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے، بہت کامیاب پرنسپل تھے آخری عمر میں قصور میں بلھے شاہ صاحب کے مزار میں، ایک کوٹھری میں رہنے لگے تھے۔ قدرت اللہ شہاب، دنیا کے تمام فوائد اٹھانے کے بعد صوفی ہو گئے تھے۔ اس کے لئے ''شہاب نامہ'' کا آخری باب مطالعہ فرمائیں۔

بہرحال یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ عمران خان نے اپنی وکٹری سپیچ میں پاکستان کو مدینے جیسی ریاست بنانے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ اس سے پیشتر بھی اپنی تقاریروں میں مدینے کی ریاست کی تعریف کر چکے ہیں۔ ان کے اس وعدہ سے پاکستان کے 20 کروڑ مسلمانوں کو خوشی ہونی چاہئے تھی لیکن T.v چینلز کے پروگراموں اور Press سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوام نے ان کے اس وعدہ کا کوئی خاص اثر نہیں لیا۔ تحریکِ طلوعِ اسلام اقامتِ دین کی داعی ہے۔ اس تحریک کے لئے اس سے بڑی اور اس سے زیادہ خوشی کی کوئی خبر نہیں ہو سکتی۔ تحریکِ طلوعِ اسلام ان کے اس عزم اور ان کے اس وعدہ پر اُنہیں

مبارکباد دیتی ہے اور دل کے پورے خلوص سے ان کو کامیاب ہونے کی دعا کرتی ہے۔

حضور ﷺ نے مدینہ میں جو ریاست قائم فرمائی تھی۔ چشمِ فلک نے ایسی ریاست نہ ماضی میں دیکھی تھی اور نہ اس ریاست کے بعد کہیں دنیا میں ایسی ریاست قائم ہوئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا ایک ایسی ریاست پیچھے چھوڑے جا رہا ہوں جس کی راتیں دن کی طرح روشن ہوتی ہیں۔ عمران خان نے اپنی کسی سابقہ تقریر میں، اور اس موجودہ وکٹری سپیچ میں، صرف مدینے جیسی ریاست کا ذکر فرمایا ہے، اس کے علاوہ انہوں نے اس ریاست کے متعلق کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا جس سے معلوم ہو کہ ان کے ذہن میں اس ریاست کا کیا نقشہ ہے۔ اس ریاست سے کیا ثمرات ونتائج حاصل ہوتے ہیں۔ اس ریاست میں اور باقی سیکولر ریاستوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ وہ معرفت کے راستے اور اقامت دین میں کس طرح ہم آہنگی پیدا کریں گے۔ تاہم تحریکِ طلوعِ اسلام ان کے اس عزم کا احترام کرتی ہے۔ اور توقع کرتی ہے کہ اگر وہ واقعاً اس عزم میں مخلص ہیں تو اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کی مدد فرمائے گا۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (47:7)، ترجمہ اے ایمان والو! اگر (اقامت دین میں) تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ ضرور تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ (29:69) ترجمہ: اور جنہوں نے ہماری خاطر کوشش کی ہم انہیں راستے دکھاتے چلتے ہیں وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۶۹﴾ (29:69)، یہ لوگ نہایت حسن کارانہ انداز سے سفر طے کرتے ہیں۔ اس میں افراتفری نہیں ہوتی بلکہ اس میں ایک طرح کا حسن ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی قائم کردہ ریاستِ مدینہ اور خلافتِ راشدہ کے بعد مسلمانوں میں کبھی دین قائم نہیں ہوا اور جو جماعت بھی اس موجودہ دور میں دین قائم کرنے کی کوشش کرے گی اسے کسی طرح کی راہنمائی کے لئے کاغذ کا ایک پرچہ بھی کہیں سے نہیں ملے گا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کے فوراً بعد ملوکیت آ گئی جس نے اسلامی ریاست کا خاتمہ کر دیا۔ ہماری پیشوائیت نے ملوکیت کا ساتھ دیا اور فکری اور اعتقادی طور پر اس نظریہ کو ہی ختم کر دیا۔ قرآنِ کریم کی ساری تفاسیر ملوکیت، جاگیرداری، روحانیت، پیشوائیت اور مذہب کی تائید کرتی ہیں۔ دین اور مذہب ایک دوسرے کی نقیض اور ضد ہوتے ہیں۔ ہماری پیشوائیت مذہب کی حامی اور دین کی مخالف ہے۔ ہماری پیشوائیت نے قیامِ پاکستان کی آخری مرحلہ تک ڈٹ کے مخالفت کی تھی۔ یہ حضرات سیکولر نظام کے حامی اور اسلامی ریاست کے مخالف تھے۔ قیامِ پاکستان سے پیشتر یہی قرآن، یہی حدیث، یہی فقہ ان کے سامنے تھا اور یہ قیامِ پاکستان کے مخالف تھے۔ واہگہ کے بارڈر عبور کرنے کے بعد بھی یہی قرآن، یہی حدیث، یہی فقہ ان کے سامنے تھا۔ لیکن یہ پاکستان میں داخل ہوتے ہی شریعت کے نفاذ کے قائل ہو گئے۔ مشہور عالمِ دین مفتی محمود مرحوم کا یہ بیان بہت مشہور ہے جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ پاکستان کے بنانے کے گناہ میں وہ

شامل نہیں تھے۔

قرآنی نظام قائم کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے (42:13) اس کی فرضیت اور اس کے قیام کے وجوب کا منکر کافر ہوتا ہے۔ غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنا جرم ہے (6:123)، اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے (4:97) اگرچہ ہم مسلمان ہیں لیکن ہم پیدائشی اور مردم شماری کے رجسٹر کے مسلمان ہیں۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کی حالت خود اس بات کی تصدیق کر رہی ہے۔ ہم قرآنی مسلمان نہیں ہے۔ ہمارے لئے قرآن کا ارشاد ہے: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ (49:14) عرب کے دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اے رسول (ﷺ) کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو ہم اسلام لائے ہیں ایمان تو اب تک تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔ سورۂ یوسف میں ارشاد ہے وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (12:106) اور بہت سے لوگ اللہ پر ایمان لائے مگر یہ کہ وہ مشرک کے مشرک ہی رہتے ہیں۔

غیر اسلامی نظام کے لیڈروں اور اسلامی نظام کے لیڈروں میں جو فرق ہے قرآن نے وہ اچھی طرح واضح کر دیا ہے اس فرق کو پیش نظر رکھنے کے بعد ہر شخص آزاد ہے کہ وہ کس نظام کا لیڈر بننا چاہتا ہے، اور کس نظام کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دینا چاہتا ہے۔ سورہ الانعام میں ارشاد ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ (6:123) ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں مجرموں کے سردار بنائے کہ وہ وہاں چالاکیاں کیا کریں۔ اس آیۂ کریمہ میں ارشاد یہ ہے کہ ہر غیر اسلامی نظام جو سلب ونہب اور ظلم وستم پر قائم ہوتا ہے اس نظام کے تمام افراد مجرم ہوتے ہیں لیکن اس نظام کے لیڈر اور اس کے قائدین ''اکابر مجرمین'' یعنی مجرموں کے سردار ہوتے ہیں۔ قرآن کریم قوموں کی اصلاح اور اس کے بگاڑ کا ذمہ دار لیڈروں کو قرار دیتا ہے۔ فرمایا: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ؕ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾ (14:28-29) ترجمہ: کیا تو نے (اُنہیں) نہیں دیکھا جنہوں نے خدا کی نعمت کو ناشکری میں بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے گئے، یعنی جہنم جس کی آگ میں وہ داخل ہوئے اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔ اگر آپ اس آیت کی عملی تفسیر دیکھنا چاہتے ہیں، تو ایسے لیڈروں کے کرتوت ملاحظہ فرمالیں کہ اُنہوں نے پاکستان جیسی نعمت کو کس طرح جہنم میں بدل دیا، جس جہنم میں ہم آج کل زندگی گزار رہے ہیں۔

اس کے برعکس اسلامی نظام کے ارباب بست وکشاد اور اس کے لیڈروں وحکام کے لئے قرآنِ کریم ''اولوالامر'' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے (4:59)، (4:83) ان کی اطاعت کو فرض قرار دیتا ہے۔ قرآن نے اسلامی نظام کے افسران کے لئے حاملین عرش الٰہی کے الفاظ استعمال کئے ہیں (39:75، 40:7) اسلامی اور غیر اسلامی دونوں

نظاموں کے لیڈروں کے کردار کی نقشہ کشی قرآن نے کردی ہے۔ اب جو حیثیت بھی آپ اختیار کرنا چاہیں وہ آپ کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔

اس مضمون کی تمہید یہاں ختم ہوتی ہے۔ ریاست مدینہ سے متعلق مضمون اب یہاں سے شروع کرتے ہیں۔ اس تمہید کو پڑھنا ضروری نہیں ہے اصل مضمون یہاں سے شروع ہوتا ہے جو خود مکتفی ہے۔

قرآن کریم نے مسلمان کی تعریف یہ کی ہے کہ جو شخص اس بات پر ایمان لاتا ہے کہ انسانوں کے وضع کردہ ضابطہ ہائے حیات، سب کفر ظلم، اور فسق پر مبنی ہوتے ہیں (5:44، 5:45، 5:47) اور اللہ کا عطا کردہ نظام حیات بہترین نظام ہے وہ مسلمان ہوتا ہے۔ قرآن کریم ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو قوم اس ضابطۂ حیات کو جاری کرنا چاہتی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس بات پر ایمان لاتی ہے کہ قرآن جو وعدے کرتا ہے وہ اس دنیا میں اسلامی نظام کی معرفت پورے ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ قرآن کی آئیڈلوجی پر مکمل طور پر عمل ہوتا ہے (2:208) اس کے حصے بخرے کر کے ان پر عمل کرنے سے وہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے جن کا قرآن وعدہ کرتا ہے (2:85) اسلامی نظام کا بنیادی اصولوں پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے، اس کے بعد اسلامی نظام جاری ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم اس نظام کے بنیادی اصولوں پر ایمان لائے بغیر اس نظام کو قائم کرتی ہے تو وہ نظام کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ہم پہلے ان اصولوں کی نشاندہی کرتے ہیں، اس کے بعد ان کی وضاحت پیش خدمت عالی کی جائے گی۔

1۔ نفس انسانی پر ایمان لانا۔

2۔ مستقل اقدار پر ایمان لانا۔

3۔ صفاتِ خداوندی پر ایمان لانا۔

4۔ مکافاتِ عمل پر ایمان لانا۔

خلافتِ راشدہ کے بعد سے چونکہ اسلامی نظام کسی جگہ بھی قائم نہیں ہوا، اس لئے اب یہ مختصر سی مدت، اور مختصر سی کوششوں سے قائم نہیں ہوسکتا۔ اس کے قائم کرنے میں بڑی جدوجہد اور سخت محنت درکار ہوگی۔ یہ بات ضروری ہے کہ قوم کا ایک بڑا حصہ ان اصولوں پر علی وجہ البصیرت ایمان لائے۔ حضور ﷺ نے سب سے پہلے اپنی قوم کے دلوں میں مستقل اقدار کا تصور جاگزین کیا تھا۔ اُس وقت مدینے کی آبادی 25 ہزار افراد پر مشتمل تھی جس کا براہِ راست حضور ﷺ سے رابطہ تھا۔ وہ ان اصولوں پر ایمان لائے تھے۔ مدینے سے باہر کے لوگ ان اصولوں سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے تھے۔ حضور ﷺ کے زمانہ میں دس ہزار مربع میل پر یہ ریاست پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بعد فتوحات اس تیزی سے عمل میں آئیں کہ تقریباً 6 ہزار مربع میل کا روزانہ اضافہ ہوتا تھا یہ ریاست زیادہ عرصہ اس لئے قائم نہیں رہی، کہ فتوحات تو تیزی سے ہوئیں لیکن جو آبادی اس

ریاست میں شامل ہورہی تھی ان کی کوئی تربیت نہیں ہورہی تھی اس بات کا انتظام مشکل تھا کہ مفتوح اقوام کو قرآن کے اصولوں سے روشناس کرایا جائے۔

انسانی زندگی کے متعلق شروع سے ہی دو تصور چلے آرہے ہیں۔ ایک تصور تو یہ ہے کہ انسان صرف اس طبعی جسم سے عبارت ہے۔ جو طبعی قوانین کے مطابق وجود میں آتا ہے۔ ان طبعی قوانین کے مطابق انسان اپنی زندگی گزارتا ہے اور ان ہی کے مطابق ختم ہوجاتا ہے اور انسانی جسم کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس تصورِ حیات کو مادی تصورِ حیات کہا جاتا ہے اور آج کل زیادہ تر یورپین اقوام اسی تصورِ حیات کی قائل ہیں اس تصورِ حیات کے مطابق انسان کو نہ خدا کے ماننے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی خارجی راہنمائی کی۔ انفرادی طور پر طبعی قوانین پر عمل کرنے سے ہی صحت و بیماری لاحق ہوتی ہے۔ اجتماعی طور پر ایسے قوانین وضع کر لئے جاتے ہیں جن سے معاشرہ کی ترتیب اچھی سے اچھی ہوتی جائے۔ ملک میں امن واماں قائم رہے اور ہر شخص کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ اس تصورِ حیات کے مطابق حکومت مقصود بالذات ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم زندگی کے اس تصور کو حیوانی سطح کی زندگی قرار دیتا ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (47:12) ترجمہ: جو لوگ (زندگی کی بلند حقیقت سے) انکار کرتے ہیں وہ حیوانوں کی طرح متاعِ حیات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کھاتے پیتے ہیں۔ قرآنِ کریم ان کا نظریہ حیات بیان کرتا ہے کہ وہ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ (45:24) ترجمہ: کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے ہم (طبعی قوانین کے مطابق) مرتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں اور مرورِ زمانہ ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔

اس تصورِ حیات کے برعکس ایک دوسرا تصورِ حیات ہے جو قرآنِ کریم کا عطا کردہ ہے۔ جس کے مطابق اس بات پر ایمان لانا ہوتا ہے کہ انسان صرف طبعی جسم سے عبارت نہیں ہے۔ جسم کے ساتھ ایک اور شے بھی ہوتی ہے جسے انسانی ذات، نفس، خودی، یا Self کہتے ہیں۔ جب اس شے کی نسبت خدا کی طرف ہوتی ہے تو یہ روحِ خداوندی کہی جاتی ہے اور جب اس توانائی کی نسبت انسان کی طرف ہوتی ہے تو یہ نفسِ انسانی، یا ذات کہی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم روحِ خداوندی کا تو قائل ہے لیکن روحِ انسانی کا منکر ہے۔ انسانی زندگی کا یہ تصور کہ انسان صرف جسم کا نام نہیں ہے بلکہ اس جسم کے علاوہ ایک اور شئ بھی اس کے ساتھ ہے، جسے نفسِ انسانی کہتے ہیں یہ تصورِ حیات وہ بنیاد ہے جس پر دین کی ساری عمارت قائم ہوتی ہے۔ اگر آپ نفسِ انسانی کے ہونے پر ایمان لاتے ہیں تو دین کی بات آگے چلتی ہے اور آپ مسلمان ہیں لیکن اگر آپ جسم کے ساتھ نفس کے تصور پر ایمان نہیں لاتے، تو آپ نہ تو مسلمان ہیں اور نہ ہی آپ کو دین کی ضرورت ہوتی ہے۔

نفسِ انسانی کی پرورش کرنا انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔ انسانی بچہ چند انچ کا پیدا ہوتا ہے۔ اس کے جسم کے ساتھ اس

کا نفس ہوتا ہے۔ جسم اور نفس دونوں کی پرورش کرنا انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔ جسم کی پرورش اور نفس کی پرورش کے قوانین ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ یہ صرف اسلامی نظام ہی ہوتا ہے کہ جس میں جسم اور نفس دونوں کی نشوونما بیک وقت ہوتی چلی جاتی ہے غیر اسلامی نظام میں نفس انسانی کی پرورش نہیں ہوسکتی۔ نفس کی نشوونما صرف اللہ کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوتی ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾ (4:49) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے نفسوں کا تزکیہ کرتے ہیں۔ اللہ کے قانون کے مطابق ہی تزکیہ ہوتا ہے اور ان پر تاگے کے برابر بھی ظلم نہیں ہوگا۔

نفسِ انسانی کی پرورش مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ہوتی ہے یہ مستقل اقدار ذہنِ انسانی نہیں بنا سکتا۔ یہ صرف وحی الٰہی ہی عطا کرتی ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ جہاں نفس کی پرورش کرتی ہیں، تو یہ اس کے ساتھ ساتھ معاشرہ کو درست کرتی چلی جاتی ہیں، اس طرح یہ اسلامی نظام کی بنیاد ہوتی ہیں۔ ہم صرف سمجھانے کی خاطر چند مستقل اقدار آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان سے آپ اندازہ فرمائیں کہ یہ کس طرح دونوں، نفس اور معاشرہ کو درست کرتی ہیں۔

(1) احترام انسانیت ایک مستقل قدر ہے چونکہ انسانی ذات ہر بچہ کو یکساں ملتی ہے اس لئے ہر انسان صرف انسان ہونے کی وجہ سے واجب الاحترام ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70) ہم نے تمام انسانوں کو واجب الاحترام بنایا ہے۔ یہ وہ مستقل قدر ہے جس کو کسی بھی مقصد کی خاطر چھوڑا نہیں جا سکتا۔

(2) دوسری قدر یہ ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں طور واجب الاحترام ہیں۔ اس کے بعد احترام کے مدارج ان کے اعمال کے مطابق طے ہوں گے۔ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ (46:19) ترجمہ: ہر شخص کے مدارج ان کے اعمال کے مطابق ہوں گے۔ عزت و تکریم کا معیار انسان کے ذاتی جوہر ہوں گے۔ حسب نسب، دولت، عہدہ، یہ اضافی نسبتیں عزت کا معیار نہیں ہوں گی۔

(3) اسلامی نظام کی ایک مستقل قدر عدل کرنا بھی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ (16:90) ترجمہ: یقیناً اللہ عدل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ارشاد ہوتا ہے کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اس کے ساتھ عدل نہ کرو، ہمیشہ عدل کرو کہ یہ تقویٰ کے قریب ہے۔ اسلامی نظام کا ایک فرد اس قدر پر اس لئے عمل کرتا ہے کہ اس کا نفس مضبوط ہو۔ اصل Target نفس کا تزکیہ ہے، لیکن آپ غور کریں کہ اس قدر پر عمل کرنے سے معاشرہ کس درجہ بہتر ہوتا ہے۔

(4) جرم کی پاداش۔ بلا کسی امتیاز کے ہر شخص کو جرم کی سزا دینا۔ اس میں امیر و غریب کا امتیاز نہ کرنا۔ یہ ایک مستقل قدر ہے کہ قانون کا اطلاق سب پر برابر ہو۔

(5) ہر شخص اپنی ذمہ داری خود اٹھائے۔ کسی کی ذمہ داری کوئی دوسرا شخص نہیں اٹھا سکتا (6:64) ترجمہ: کوئی بوجھ

اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

(6) کوئی کسی کا محکوم یا غلام نہیں ہوسکتا۔ انسان کی حکومت انسان پر حرام ہوتی ہے (3:79)، لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (17:22) ترجمہ: اللہ کے علاوہ، اللہ کے ساتھ کسی کو حاکم نہ بناؤ۔

(7) ہر شخص پر قانون کا اطلاق برابر ہوگا۔ یہاں تک کہ صدر مملکت بھی قانون کا پابند ہوگا۔ صدرِ مملکت کو استثناء دینا قرآن کے خلاف ہے (6:163،46:9)

(8) امور مملکت نااہل لوگوں کے سپرد نہ کئے جائیں۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ (4:58) ترجمہ: اللہ تمہیں اس بات کا حکم دیتا ہے کہ تم ذمہ داریاں اُن کے سپرد کرو جو اس کے اہل ہوں اور جب لوگوں میں فیصلہ کرو تو ہمیشہ عدل کی رو سے فیصلہ۔ آپ غور فرمائیں کہ اس قدر پر عمل کرنے سے معاشرہ کس طرح انصاف سے پُر ہوگا۔

(9) زائد از ضرورت مال نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے کھلا رکھو۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219) پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی فلاح کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔

(10) ہر شخص کے رزق کی ذمہ داری اسلامی نظام کا فریضہ ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6)، ترجمہ زمین میں کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ جن ذمہ داریوں کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے وہ سب ذمہ داریاں اسلامی نظام پوری کرتا ہے۔

ہم نے یہاں صرف سمجھانے کی خاطر دس اقدار کا ذکر کیا ہے آپ دیکھیں گے کہ ہر شخص ان اقدار پر اس لئے عمل کرتا ہے تاکہ اس کا نفس مضبوط ہو۔ وہ جسم کی مدت کے بعد زندہ رہے اور بلند مراتب و درجات کا سفر طے کرتا رہے۔ وہ اگلی نوع میں منتقل ہو جاتا ہے اور یہی اس نفس کا جنت میں جانا ہوتا ہے۔ لیکن ان میں سے ہر قدر معاشرہ کو بہتر سے بہتر کرتی چلی جاتی ہے۔ سیکولر حکومتوں کی کوئی اساس نہیں ہوتی وہ مقصود بالذات ہوتی ہیں۔ اسلامی نظام کی اساس انسانی ذات اور مستقل اقدار ہوتی ہیں۔ اسلامی نظام مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ یہ مقصود بالغیر ہوتا ہے اس کا مقصد نفس انسانی کا تزکیہ کرنا ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داریوں میں ایک ذمہ داری لوگوں کا تزکیہ کرنا بھی تھا (2:129) یہ تزکیہ پرستش سے نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ تزکیہ اسی طرح ہوتا ہے کہ اسلامی نظام قائم کیا جائے اور اس میں مستقل اقدار اور صفات خداوندی پر عمل کیا جائے تو نفس اور معاشرہ کا از خود تزکیہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ مستقل اقدار پر عمل انسانی ذات اور اسلامی معاشرہ دونوں کا تزکیہ کرتا چلا جاتا ہے۔

حیوانی، سطح کی زندگی اور انسانی سطح کی زندگی میں یہ فرق ہوتا ہے کہ ''نفخِ روح'' کے ذریعے انسان کو ذات مل جاتی ہے اللہ تعالیٰ کی ذات مکمل ترین ذات ہے اور انسان کی ذات ایک محدود ذات ہوتی ہے جو ہر انسان کو غیر نشوونما حالت میں ملتی ہے۔ اس ذات کو نشوونما دینا انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ صفات خداوندی کو اپنے میں زیادہ سے زیادہ پیدا کرنا، ہر انسان کا فرض ہے۔ ان صفاتِ خداوندی کا تقاضہ یہ ہے کہ ان پر عمل کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ، رب، کریم، حکیم، عزیز، واسع، بصیر وشاکر صفات کا حامل ہے۔ ہم ان صفاتِ خداوندی پر ایمان لاتے ہیں۔ لیکن یہ صفات یہ تقاضہ کرتی ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے۔ ہر شخص دوسروں کی ربوبیت کرے، ہر شخص دوسروں کے ساتھ عدل کرے، ہر شخص دوسروں کے ساتھ اکرام سے پیش آئے۔ جس درجہ صفات خداوندی اپنے میں پیدا کی جائیں گی، اسی قدر قرب خداوندی حاصل ہوتا ہے اسلامی نظام بھی ان صفات پر عمل کرتا ہے۔ اسلامی نظام اپنے تمام شہریوں کی ربوبیت کرتا ہے، ان کے درمیان عدل قائم رکھتا ہے۔ اس نظام میں ہر شخص کی عزت تکریم ہوتی ہے۔ اسلامی نظام میں جب ہر فرد صفات خداوندی پر عمل کرتا ہے اور خود ریاست بھی ان صفات کو عمل میں لاتی ہے تو صفاتِ خداوندی ٹھوس شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ معاشرہ میں ہر طرف صفات خداوندی جلوہ گر ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذات باری اپنی تمام صفات کے ساتھ اس زمین پر جلوہ گر ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذات باری اپنی تمام صفات کے ساتھ اس زمین پر جلوہ گر ہوگئی ہے۔ ریاست اور افراد کی زندگی کا مقصد ایک ہو جاتا ہے، یعنی صفاتِ خداوندی پر عمل کرنا، اور ان کو عام کرنا۔

اسلامی مملکت کا چوتھا عقیدہ مکافاتِ عمل پر ایمان لانا ہے کہ انسان کے ہر عمل کا ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ نتائج قوانین خداوندی کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔ جو شخص زہر کھاتا ہے وہ مر جاتا ہے اور ہم خود اپنی آنکھوں سے اس کا مرنا دیکھتے ہیں۔ جس طرح طبعی دنیا میں ہر کام کا ایک نتیجہ نکلتا ہے اسی طرح انسانی دنیا میں نتائج برآمد ہوتے ہیں اور یہ مکافات عمل کہلاتا ہے۔ جو شخص حرام مال کھاتا ہے اس کے نفس پر نہایت بُرا اثر پڑتا ہے۔ لیکن ہمیں اس پر پورا یقین نہیں ہوتا اگر کسی شخص کو حرام مال کھانے پر بُرے اثرات مرتب ہونے کا اتنا پکا یقین ہو جائے جتنا زہر کھانے سے مرنے کا، تو کوئی بھی حرام مال نہ کھائے۔ اسلامی نظام میں اس قدر پکا یقین ہوتا ہے، اس لئے اس نظام میں خود بخود انسدادِ جرائم ہو جاتا ہے۔ اس نظام کے شہری اپنی نفس کو بُرے اثرات سے محفوظ کرنے کی خاطر جرائم نہیں کرتے۔ لیکن اس کا ایک بہترین نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرہ خود بخود سُدھرتا چلا جاتا ہے۔

اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے پوری قوم کو ان نظریات پر ایمان لانا ہوتا ہے۔ اسلامی نظام کی Definition یہ ہے کہ اس نظام کی اطاعت ہی عبادت خداوندی ہوتی ہے۔ چونکہ اس نظام کی اطاعت ہی عبادتِ خداوندی ہوتی ہے اس لئے اقامت دین کے بعد پرستش کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ پرستش مذہب میں ہوتی ہے جس کی بنیاد روح اور

روحانیت پر ہوتی ہے، دین میں اطاعت ہوتی ہے جس کی اساس ذات اور نفس پر ہوتی ہے۔ پرستش کے نتائج مرنے کے بعد سامنے آتے ہیں۔ دین کے نتائج اس دنیا میں سامنے آتے ہیں۔ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ط (24:53) اطاعت معروف ہوتی ہے۔ اس کے نتائج اس دنیا میں دکھائی دیتے ہیں۔ پرستش کے لئے پرستش کرنے کے مخصوص مقامات، مساجد ہوتی ہیں۔ دین میں تمام عدالتیں، تھانے، تحصیلیں، NGO'S، پارلیمنٹ جہاں جہاں بھی قوانین خداوندی جاری ہوتے ہیں سب مساجد اللہ ہوتے ہیں، اور ان قرآنی احکامات کی اطاعت عبادت خداوندی ہوتی ہے۔ سیکولر ریاستوں میں سیکولر قوانین کی نافرمانی جرم ہوتی ہے۔ اسلامی ریاست میں ریاست کی نافرمانی، Sin ہوتی ہے۔ اسلامی ریاست میں ہر جرم، گناہ بھی ہوتا ہے۔ اس میں Sin اور Crime ایک ہوجاتے ہیں۔ اس ریاست میں چونکہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہوتی ہے مستقل اقدار پر عمل ہوتا ہے۔ صفات خداوندی عملاً نافذ ہوتی ہیں۔ جس شخص کو نفس یا ذات پر ایمان نہیں ہوتا اس کو اسلامی ریاست قائم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ جو لوگ روح، روحانیت، معرفت کے قائل ہوتے ہیں اُنہیں بھی اسلامی نظام کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ ان کے نزدیک روحانیت میں ترقی پرستش کے ذریعے ہوتی ہے اور پرستش ہر جگہ ہوسکتی ہے، ہندوستاں، انگلینڈ سب جگہ پرستش کی اجازت ہے۔

اس نکتہ کی وضاحت کے بعد آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اسلامی نظام کی کوشش کرنا، اور معرفت کی راہ اختیار کرنا، بالکل دو متضاد راہیں ہیں۔ عمران خان نے اگر 30 سال سے معرفت کا راستہ اختیار کیا ہوا ہے، تو یہ راستہ انہیں جنگلوں، کونوں، زاویوں تک تو لے جائے گا کہ ان مقامات پر سکون سے پرستش ہوتی ہے۔ لیکن یہ ''معرفت'' کا راستہ اُنہیں مدینے کی ریاست طرف قطعاً نہیں لے جاسکتا۔

ہمیں عمران خان سے توقع ہے۔ انہوں نے مدینے کی ریاست کو جو اہمیت دی ہے اس سے اس توقع میں مزید اضافہ ہوا ہے ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ تحریکِ طلوع اسلام کا فراہم کردہ لٹریچر مطالعہ فرمائیں۔

حضرت عمرؓ کے بچپن کا ایک دوست حضرت عمرؓ سے ملنے آیا اور اس نے چند روز ان کے ہاں قیام کیا۔ اس نے حضرت عمرؓ کو قریب سے دیکھا اور حضرت عمرؓ کے رات دن کے مشاغل دیکھے۔ اس نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ عمر (رضی اللہ عنہ) تم نے اسلام کی تبلیغ اور اس کے فروغ کے لئے بہت محنت کی دن رات اسلام کی خدمت کی اور اسلام کو چار چاند لگا دیئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم نے درست بات نہیں کی۔ عمر نے اسلام کو چار چاند نہیں لگائے، بلکہ اسلام نے عمرؓ کو چار چاند لگا دیئے ورنہ خطاب کی تو اور بھی اولاد ہے ان کو کوئی نہیں پوچھتا۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عمران خاں کو قرآنی اقدار نافذ کرنے کے مواقع اور توفیق عطا کرے کہ قرآن ان کو چار چاند لگا دے۔

محمد علی صابر صدیقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نشست نمبر9

نوجوانوں کا صفحہ

نخلِ سینا

ہڑتال کا لفظ ہم ہر روز سن رہے ہیں۔ایک محقق کے نزدیک یہ غلط العام لفظ ہے اصلی لفظ ہے ہٹ تال یعنی دکان کو تالا لگا دینا۔محقق کا کہنا سر آنکھوں پر لیکن عوام اسے شروع ہی سے ہڑتال کہتے آرہے ہیں۔تقسیم ہند سے پہلے یعنی غلامی کے دور میں ہڑتالیں سیاسی ہوا کرتی تھیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے صرف غیر سیاسی ہڑتال اس وقت ہوئی جب لاہور کے انگریز مئیر مسٹر میکناب کی کسی بات پر خفا ہوکر بھنگیوں اور خاکروبوں نے ہڑتال کر دی یہ اس زمانے میں ایک منفرد واقعہ تھا۔جواب منفرد نہیں رہا۔آج بھی نصیب دشمناں وکلاء کی طبیعت جو ناساز ہوئی تو وکلا نے اپنا جمہوری حق استعمال کرتے ہوئے کورٹ میں توڑ پھوڑ کر دی۔

کلیم الزماں صاحب کا مہمان بننے کے لئے چند وکلاء نے ان کی رہائش گاہ کا رخ کیا۔کلیم الزماں صاحب نے اپنی دہلوی روایات کو قائم رکھتے ہوئے نہایت خندہ پیشانی سے ان مہمانوں کا استقبال کیا اور تشریف آوری کا مقصد دریافت کیا تو سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ایک نے جرأت کر کے کہا کہ ہم آج آپ کے ہاں صرف چائے پینے کے لئے آئے ہیں۔ دوسرے نے کہا کہ پکوڑے بھی۔کلیم الزماں نے وکلاء کی جرأت کا استقبال کرتے ہوئے کہا بڑی خوشی کی بات ہے اس کا مطلب ہے ہماری نشست کافی طویل ہوگی۔ پشاور سے سوغات کے طور پر مجھے ایک دوست نے پنیر بھیجا ہے میں آپ کو چائے کے ساتھ پنیر والے پکوڑے کھلاؤں گا یہ کہہ کر کلیم الزماں نے اپنے ملازم فضل کریم کو آواز دی اور چائے کے ساتھ پکوڑے تیار کرنے کے لئے کہا۔اس کے بعد کلیم الزماں نے مہمانوں کی طرف دیکھا تو ایک سنجیدہ قسم کے وکیل نے کہا۔کلیم صاحب! میں نیا نیا لاہور میں آیا ہوں۔ میرا نام علی عمران ہے۔ میں صرف یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اخباروں میں جس نخل سینا سکول اور نخل سینا تحریک کا ذکر ہو رہا ہے اس کی نوعیت کیا ہوگی کچھ تفصیل بتا سکتے ہیں آپ؟ کلیم صاحب نے نوجوان وکیل کو جواباً کہا کہ برخوردار نخل سینا سکول ابتدائی مراحل میں ہے۔ جہاں تک تحریک کا تعلق ہے وہ آپ جیسے نوجوانوں کے ہاتھ سے چلے گی۔نخل سینا سکول میں صرف یتیم بچوں کو داخلہ ملے گا جن کے آگے پیچھے کوئی والی وارث نہ ہو۔

علی عمران: کیا میں یہ معلوم کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ آپ نے صرف یتیم بچوں ہی کے لئے یہ سکول

قائم کیا ہے، کوئی وجہ تو ہوگی؟

کلیم الزماں: برخوردار! میں سمجھا تا ہوں آپ کو کہ میں کیوں ہستے بستے گھروں کے بچوں کو سکول میں نہیں لینا چاہتا ایسے بچے جو نام نہاد پڑھے لکھے خاندانوں سے آتے ہیں وہ اپنے ذہن میں ایسے تصورات بھی ساتھ لاتے ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر معجزہ شق القمر کو لے لیجئے۔ ہماری کتب تفاسیر میں یہ بیان موجود ہے کہ حضور ﷺ کی انگلی کے اشارے سے چاند دولخت ہو گیا اسکے دونوں ٹکڑے زمین پر آ گئے اور ان میں سے ایک ٹکڑا حضور ﷺ کی ایک بغل کے نیچے سے اور دوسرا دوسری بغل کے نیچے سے گزر کر دوبارہ آسمان پر جا کر جڑ گئے۔ یہ تو پرانے مفسرین کی باتیں ہیں آجکل کے ماڈرن مفسر بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ جنوبی ہند میں کموچین اور کالی کٹ کے مہاراجاؤں نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ کیوں برخوردار علی عمران صاحب آپکا اس معاملہ میں کیا خیال ہے۔

علی عمران: انکل! میں گوش نصیحت نیوش رکھتا ہوں۔

کلیم الزماں: تو سنو! اسی قسم کے تصورات معراج نبوی کے متعلق بھی تفاسیر میں موجود ہیں۔ ہمارے راویان جو کاسمالوجی (Cosmology) یا علم الافلاک سے بے خبر تھے انہوں نے اللہ تعالیٰ کو سات آسمانوں سے اوپر عرش پر بٹھا رکھا تھا حالانکہ وہ کہتا ہے کہ تم جہاں کہیں بھی ہو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ (57:4) میں تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہوں۔ علامہ اقبال کا وہ شعر تو تم نے سنا ہوگا۔

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے زاہد
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

اسی طرح واقعہ کربلا ہے۔ برخوردار علی عمران صاحب! آپ کو اپنے سوال کا جواب مل رہا ہے یا نہیں۔ آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی حالت دیکھ کر مجھے احساس ہو رہا ہے کہ کچھ لوگ میرے خیالات سے متفق نظر نہیں آتے۔ سنئے! پاکستان میں علم دوست گھرانے بہت کم رہ گئے ہیں جس کے پاس ادرک کی دو گٹھڑیاں جمع ہو گئیں وہی پنساری بن بیٹھا ہے۔ اگر ہم اس قسم کے گھرانوں کے بچوں کو اپنے سکول میں داخلہ دیں گے تو ہمارے نصاب تعلیم سے بے خبری کی وجہ سے ان کے ماں باپ دوڑتے ہوئے آئیں گے اور شکایت کریں گے کہ استاد ان کے بچوں کے عقیدے خراب کر رہے ہیں۔ ہم یہ نہیں چاہیں گے کہ کسی کو ہم سے کوئی شکایت ہو، اس لئے ہم ایسے نصاب تعلیم پر عمل پیرا رہنا چاہیں گے جس پر خود عقل و دانش انگلی نہ اٹھا سکے اور بچوں کو ایسی تعلیم دیں کہ فرسودہ خیالات کو اپنے دل و دماغ میں جگہ نہ دیں جنہیں وقت کے تقاضے اور علم و عمل کے نئے زاویئے پہلے ہی دیس نکالا دے چکے ہیں۔

وکیل اوصاف علی: کلیم صاحب! یہ تو آپ نے نئی بات کر دی جو ہم نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔

کلیم الزماں: برخوردار! ہزاروں باتیں دنیا میں ایسی ہیں جو میں نے بھی آج تک نہیں سنیں اور لاکھوں تصوارت ایسے ہونگے جن سے میں آشنا نہیں ہوا۔ نہ ہو سکتا ہوں۔ میں نے جو بات کہی ہے۔ وہ عین فطرت کی مطابق ہے میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ قانون فطرت کو کبھی جھٹلانے کی کوشش

نہ کریں۔

وکیل اوصاف علی: وہ کیسے؟ ذرا وضاحت فرما دیجئے۔

کلیم الزمان: وہ ایسے کہ زندگی کی نمود پہلے نباتات میں ہوئی پھر ایک جرثومہ حیات سے آگے بڑھی جو مختلف منازل طے کرتی ہوئی انسان کے روپ میں نمودار ہوئی ہے۔ انسان کا سب سے بڑا اور منفرد وصف اخلاق و ایثار ہے جسے کسی نہ کسی دور میں عام ہونا ہے۔ نباتات کے پھیلاؤ کو دیکھئے۔ گندم سب سے پہلے کہا جاتا ہے کہ عراق کے علاقہ میں خودرو پودے کی صورت میں پیدا ہوئی۔ اس گندم کے دانے کے چھلکے کے ساتھ پر لگے ہوتے تھے جو آجکل ناپید ہیں۔ ان چھلکوں کی مدد سے گندم کا بیج ہوا کے دوش پر دریاؤں، ندی نالوں اور سمندر کی لہروں کے ذریعہ سے کرۂ ارض کے مختلف علاقوں تک پھیلا ہے۔ اس قسم کا عمل دنیا کے دوسرے علاقوں میں بھی ہوا ہوگا۔ اسی طرح گلاب کا پھول یک لخت پیدا نہیں ہوا۔ اس نے بھی اپنے ارتقا کے لئے کئی منزلیں طے کی ہونگی۔ جب کہیں اصلی رنگ کا گلاب پیدا ہوا ہوگا۔

وکیل اوصاف علی: گلاب تو کئی قسم کے ہیں۔ پیلا بھی ہے کالا بھی سرخ بھی ہے اصل کونسا ہے ان میں؟

کلیم الزماں: اصل گلاب کا رنگ وہ رنگ ہے جو آپ اپنی بیگم کے رخساروں پر دیکھنا پسند کریں گے۔ اب سمجھے آپ جس طرح اس رنگ کا گلاب عام ہو گیا ہے، اسی طرح زندگی کا آخری پھل ایثار ہے، اخلاق ہے جو گلاب کی طرح عام ہو کر رہے گا۔ (حاضرین پر اچٹتی نظر ڈالتے ہوئے) آپ لوگ تو میری باتوں میں محو ہو گئے۔ پکوڑے تو کھائیے یہ روز روز تو مل نہیں سکتے کیونکہ پشاور جیسا پنیر لاہور میں کہاں ہے۔

وکیل شبیہ الحسن: کلیم صاحب! پکوڑوں سے زیادہ لذیذ آپ کی گفتگو ہے لیکن اس ساری بحث کا حاصل بتائیے۔

کلیم الزماں۔ بحث کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح مذکورہ گندم کو پروں کی ضرورت نہیں رہی تھی اسی طرح ہمیں بھی اپنے معاشرے کے غیر ضروری پر جھاڑ دینے چاہیں۔ اگر آپ خود ایسا نہیں کریں گے تو زندگی آپ کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیگی۔

زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است
اے کہ در قافلہ باہمہ رَو بے ہمہ شو

مجھے یقین ہے کہ آپ میں سے کچھ اصحاب ایسے بھی ہونگے جو کورٹ میں ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو ظالم ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوں اور پھر بھی ان کا ضمیر مطمئن رہتا ہو۔ لیکن یہ آپ کا قصور نہیں معاشرے کے دستور کا قصور ہے۔ میں ایک شق گنواتا ہوں کہ خرابی کہاں کہاں ہے۔ ہمارے دستور کا سرنامہ ہے کہ کوئی قانون قرآن وسنت کی تعلیم کے خلاف نہیں بنایا جائیگا۔ قرآن مجید میں صریحاً یہ بات موجود ہے کہ فرقہ بندی شرک ہے اور فرقہ بند قوم کا رسول کریم ﷺ سے کوئی علاقہ نہیں رہتا لیکن ہم نے فرقہ بندی کو مکاتب فکر کا نام دے کر دستور کا حصہ بنا دیا ہے۔ (دیکھئے سورۃ الانعام 159) فرقہ بندی کو قرآن مجید شرک کہتا ہے اور شرک ایسی چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کوئی معافی نہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ دیکھنا

کہیں مشرک نہ ہو جانا ایسے لوگوں کی طرح جنہوں نے دین میں فرقہ بندی کی اور ہر پارٹی خوش ہوئی کہ صرف وہی راہ راست پر ہے۔ (سورہ الروم (32-31) یہاں صرف مطلب بیان کیا گیا ہے۔ جب بھی الیکشن ہوتا ہے تو پوری قوم پارٹیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اگر چھوٹی بڑی پارٹیوں کو گنوایا جائے تو ان کی تعداد سو سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید میں 114 سورتیں ہیں ممکن ہے کبھی پارٹیوں کی تعداد بھی ایک سو چودہ ہو۔ قرآن مجید نے ہم پر منافقت کے ساتھ ساتھ ظلم، فسق و فجور، کفر اور شرک کا حکم صادر کر کے کہہ دیا ہے کہ تمہارا رسول کریم ﷺ سے کوئی واسطہ نہیں لیکن مسلمان کہتا ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ ہم تو ہر وقت ہر روز قرآن خوانی اور نعت خوانی کرتے ہیں۔ آپ سب وکلا کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں آپ کو ایک وکیل کی کہانی سناتا ہوں جو روایت کے طور پر مشہور ہے۔ سرسید احمد خان کے صاحب زادے محمود مرحوم کے متعلق۔ مولانا عبدالرزاق کانپوری نے اپنی کتاب یادایام میں لکھا ہے کہ وہ بڑے طباع انسان تھے۔ ان کے ہاں اپنی مہمانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا حافظہ بہت مضبوط تھا۔ فارسی شعرا کے دیوان پر دیوان زبانی یاد تھے۔ وہ رات بھر انہیں گرم گرم چائے پلاتے رہے اور اسی بہانے بار بار اندر جا کر چسکی لگاتے رہے کیونکہ انہیں شراب پینے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ہر وقت نشے میں رہتے تھے۔ ان کے متعلق روایت ہے کہ کسی مقدمہ میں وہ ایک ایسے شخص کے وکیل تھے۔ جس پر قتل کا الزام تھا کورٹ میں بحث کے دوران دلیل پر دلیل دئے جاتے تھے جو ان کے مؤکل کے خلاف جاتی تھی اور اسے مجرم قرار دینے کے لئے کافی تھیں۔ مؤکل کے لواحقین میں سے کسی اور نے ان کو غلطی کا احساس دلایا تو ذرا ہوش میں آئے اور جج صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ جناب عالی! یہ سب وہ دلائل ہیں جو میرا مد مقابل میرے مؤکل کے خلاف لا سکتا ہے۔ میں ان دلائل کی کمزوری ابھی بیان کرتا ہوں اور پھر اپنے دیئے ہوئے دلائل کے ایک ایک کر کے پرخچے اڑا دیئے۔ میں نے یہ کہانی رومن لا کی کمزوری یا اس کی پریکٹس کی کمزوری کے لئے بیان کی ہے کہ۔

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

میں ان تمام مراحل سے گزر چکا ہوں جن سے آپ نوجوانوں کا واسطہ ہے لیکن ایک بات ذہن میں رکھئے کہ آپ آئندہ زندگی میں To Have پر عمل کریں گے یا To be پر۔ یاد رکھئے یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند بتانِ وہم و گماں لا الہ الا اللہ۔

وکیل فضل ربی: کلیم صاحب! آپ نے اکبر الہ آبادی کا یہ شعر کبھی سنا ہے کہ

تمہارے وعظ میں تاثیر تو ہے حضرت واعظ
اثر لیکن نگاہِ ناز کا بھی کم نہیں ہوتا

کلیم الزماں: برخوردار! یہ شعر تو میں نے پہلے بھی سنا تھا مگر میں تمہارا مقصد سمجھ گیا ہوں نگاہ ناز کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک تو معاشرے میں حرام خوری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور پھر تکاثر کی وجہ سے اوباشی کو دل چاہتا ہے اور تمہارے پیشہ میں مؤکل سے غداری پر منتج ہوتی ہے اور کبھی آمرانہ ذہنیت نگاہ ناز بن جاتی ہے لیکن ایسی نگاہ ناز کا انجام کیا ہوتا

ہے اسے اخباروں میں پڑھ لو۔

وکیل اوصاف علی: کلیم صاحب! ہم معافی چاہتے ہیں کہ ہم سب نے بن بلائے مہمان بن کر آپ کو تکلیف دی لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم آپ کی محفل سے اٹھیں گے تو بہت کچھ لے کر اٹھیں گے۔ میں استدعا یہ کرونگا کہ آپ ہمیں اپنے ذاتی تجربات سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔

کلیم الزماں: برخوردار! میرے ذاتی تجربات تو اسی قسم کے تھے جو ایک عام وکیل یا معمولی جج کو پیش آتے ہیں لیکن علامہ اقبال کو پڑھنے اور ان کی نگارشات کی تشریح کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مفلسی جس طرح انسان کے اعصاب کو کمزور کر دیتی ہے۔ اسی طرح دولت کی فراوانی بھی ڈائن بن کر انسان کے دل و دماغ کو مفلوج کر کے اسے ایک جانور بنا دیتی ہے اور پھر وہ اپنی انسانیت کی تلاش میں کبھی خیرات کرتا ہے کبھی اوقاف بناتا ہے، کبھی ٹرسٹ قائم کرتا ہے اور کبھی نخل سینا کی طرح کوئی تحریک چلاتا ہے۔ میری طرح ذہن میں یہ نسخہ یاد رکھتا ہے کہ ان الحسنات یذہبن السیآت۔ میں تو جب کبھی نماز کی مستی سے ہوش میں آتا ہوں تو یہ دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ

فقر بخشی با شکوہِ خسروِ پرویز بخش
یا عطا فرما خرد با فطرتِ روح الامین

میری نصیحت ہے کہ آپ لوگ وکلا کی حیثیت سے تو قانون کو سمجھنے کے لئے کافی محنت کرتے ہیں۔ لیکن ایک اچھا وکیل بننے کے لئے ضروری ہے کہ ادب عالیہ کا مطالعہ بھی ساتھ ساتھ ہوتا رہے اور نماز، روزے، حج، قربانی وغیرہ کے فرائض اور مشاغل کے ساتھ غالبؔ کی نصیحت یاد رہے کہ

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند
حق را بسجودے و نبی را بہ درودے

مفہوم: اُس قوم سے نہ ہونا کہ جو دھوکا دیتے ہیں۔ اللہ کو سجود سے اور نبیؐ کو درود سے۔

قائداعظم انگریزی ادب سے اچھی طرح واقف تھے اور جوانی میں وہ لندن میں قائم شکسپیر ین کلب کے ممبر بھی تھے لیکن انہیں اردو ادب پڑھنے کا زندگی میں موقع نہیں ملا۔ پچھلے دنوں ایک مشہور صحافی یہ غلط بیانی کر رہے تھے کہ قائداعظم اردو شعر و ادب کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ جس کی تردید ہمارے ایک دوست صدیقی صاحب کے بیان سے ہوتی ہے۔ جنہوں نے 24 مارچ 1940ء کو پنجاب یونیورسٹی ہال میں منعقد ہونے والی تقریب میں قائداعظم کو علامہ اقبال کے خیالات پر تقریر کرتے ہوئے سنا تھا۔ قائد اعظم کی تقریر انگریزی میں تھی انہوں نے فرمایا میں سمجھتا ہوں کہ شیکسپیئر گوئٹے، ملٹن، شیلے اور کیٹس وغیرہ بہت بڑے بڑے شاعر تھے لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ہمارا اقبال ان سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا مجھے ان کا یہ شعر اچھی طرح یاد ہے کہ ؎

ہندوستان بھی ہمارا ہے
اور سارا جہاں بھی ہمارا ہے

میں نے آپ کو یہ بات اس لئے بھی سنائی ہے کہ ریکارڈ میں رہے کہ قائداعظم اردو ادب سے واقف نہیں تھے۔

خصوصی اپیل

(بے مثال تفسیر قرآن کی نشر و اشاعت کے لئے تعاون کی درخواست)

غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ نے ساری عُمر قرآن کریم کی تحقیق، تعلیم اور ترویج کرنے میں بسر کی۔ اُنہوں نے خالص قرآن کی مدد سے عصرِ حاضر کے علمی، تحقیقی، سائنسی اور تنقیدی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے قرآن کے اصلی پیغام الحق کو ہم تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پینتیس سال کے لگ بھگ ہفتے کے ہر جمعہ/ اتوار کو باقاعدگی سے درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ اُن کے دروس آڈیو/ وڈیو میں منتقل کئے جاتے تھے جن میں پورے قرآن کا بڑی تفصیل سے لگ بھگ ایک ہزار گھنٹے پر محیط جائزہ لیا گیا ہے۔ بعد میں انہی ٹیپ کی مدد سے اِن دروس کو ٹائپ کر کے مطالب القرآن فی دروس الفرقان کے نام سے کتابی شکل میں 41 ضخیم جلدوں میں شائع کر دیا گیا ہے۔

ادارہ طلوع اسلام نے اِسے تبلیغ کا فریضہ خُداوندی سمجھتے ہوئے نبھایا ہے اور احباب سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اِن کُتب کو ادارہ سے خرید کر زیادہ سے زیادہ لوگوں اور اداروں تک اپنا تبلیغی فرض سمجھتے ہوئے پہنچائیں۔ اِس عمل میں اگر آپ ادارہ کو مطلوبہ افراد کی فہرست فراہم کر دیں گے تو وہ اس تفسیر قرآنی کا ایک سیٹ آپ کی جانب سے آپ کے دئے ہوئے پتہ پر بھجوا دے گا۔ تعلیمی اداروں میں خصوصی طور پر تعلیمی درسگاہیں اور پبلک لائبریریاں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ادارہ کے پاس اِن کی فہرست موجود ہے جو ضرورت پڑنے پر مہیا کی جاسکتی ہے۔ آپ کو اِس امر سے یہ بھی تسلی رہے گی کہ آپ نے نہ صِرف اپنی طرف سے تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے ہوئے اللہ کے کام میں رفاقت کی سعادت حاصل کی ہے بلکہ ادارے کی بھی اِس فریضہ کی ادائیگی کو جاری رکھنے میں بھرپور مدد فراہم کی ہے۔

(41) اکتالیس ضخیم جلدوں پر مشتمل اِس منفرد تفسیر کا ہدیہ مبلغ 19000 روپے ہے۔ اگر آپ یہ تفسیر کسی لائبریری یا دوست کو گفٹ کرنا چاہتے ہیں تو ادارہ کو صرف -/15000 روپے ارسال کر دیجئے۔ ادارہ آپ کی جانب سے یہ تفسیر قرآن مطلوبہ لائبریری یا فرد تک بھجوا دے گا۔ عطیات کے لئے ادارہ کا اکاؤنٹ نمبر درج ذیل ہے۔ ہماری دلی تمنا یہ ہے کہ دروس القرآن کی یہ اکتالیس (41) ضخیم جلدوں پر مشتمل قرآنِ کریم کی مکمل تفسیر پاکستان کی ہر یونیورسٹی کی لائبریری کی زینت بنے تاکہ وہاں کے تمام طالب علم قرآنِ کریم کی اس بے مثال تفسیر سے استفادہ کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری معصوم آرزو کو شرف قبولیت بخش دے اور صاحب حیثیت لوگ اس سلسلے میں آگے بڑھیں اور اس کام میں ہماری مدد کریں تاکہ تبلیغ دین کے اس فریضہ سے ہم سب عہدہ برا ہو سکیں۔ شکریہ

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-	سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	250/-	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(9)	530	550/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-	سورۂ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۂ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۂ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-				
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الکہف وسورہ مریم	(18-19)	532	500/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

بشیر احمد عابد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الۡعَظِيۡمِ (69:52)

قرآن کریم کی آواز جب نبیٔ آخرالزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کی لسانِ مبارک سے وادیٔ فاران میں پھیلنی شروع ہوئی اور مخاطب قوم، قریش نے دیکھا کہ مظلوم ومجبور اور ان کے استحصال کا نشانہ بنے انسان، جوق در جوق اس ندائے حیات آور کی طرف بڑھ رہے ہیں، تو انہوں نے اسے روکنے کے لئے جو حکمتِ عملی وضع کی، اسے قرآنِ حکیم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

لَا تَسۡمَعُوۡا لِهٰذَا الۡقُرۡاٰنِ وَالۡغَوۡا فِيۡهِ (41:26)

انہوں نے یہ روش کیوں اختیار کی، اسے علامہ محمد اقبالؒ نے بڑے ہی دلآویز پیرایہ میں نوحۂ ابوجہل کے عنوان سے پیش کیا ہے، جسے وہ غارت گرِ دین ودانش، کعبہ کا غلاف تھام کر رو رو کر گاتا تھا اور کہتا تھا کہ ؎

از محمدؐ سینۂ ما داغ داغ
از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ
تا بساطِ دینِ آبا در نورد
با خدا وندانِ ما کرد آنچہ کرد
مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب
از قریش و منکر از فضل عرب
درنگا ہے او یکے بالا وپست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ
باکلفتانِ حبش در ساختہ
احمران با اسوداں آمیختند
آبر وئے دود ما نے ریختند
باز گواے سنگِ اسود باز گو
آنچہ دیدم از محمدؐ باز گو

اللہ کے اس پیغامِ ازلی کی تبلیغ کے اس روزِ اوّل سے آج تک مفاد پرست عناصر کی یہی روش رہی ہے۔ خواہ ان عناصر کا تعلق ایوانِ حکومت سے ہو، سرمایہ داروں کی دنیا سے ہو اور چاہے یہ مسانید مذہبی پیشوائیت سے متعلق ہوں۔

باقی دنیا کو تو چھوڑیئے۔ ہندوستان میں سرسید احمد خان علیہ الرحمۃ نے جب رجعت الی القرآن کی نشیدِ جانفزا سنائی تو ان کی مساعی کے راستے میں ہر طرح کے الزامات، اتہامات

اور فتاویٰ کی رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ علامہ حافظ محمد اسلم جیراج پوری بھی عمر بھر انہی دشنام طرازیوں کا ہدف بنتے رہے۔ علامہ محمد اقبالؒ کا کلیجہ بھی ایسے ہی ناوک ہائے تیز وتند سے چھلنی کیا جاتا رہا اور ان کے بعد مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ بھی انہی طوفانوں کے سامنے، قرآن کریم کی خالص اور منزہ تعلیم کے بند باندھتے رہے۔ ان میں سے ہر ایک، ان صاحبانِ دین متین اور مفتیانِ شرعِ مبین کے شرارہائے بولہبی کے جواب میں یہی کہتا رہا کہ جو تمہارے جی میں آئے کرو، ہم تو اپنا فریضہ اس لئے انجام دیتے رہیں گے کہ ؎

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ

مفکرِ قرآں پر جہاں اور بہت سے مختلف النوع الزامات لگائے گئے، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ آپ قرآنِ کریم کی آیات کا مفہوم توڑ مروڑ کر یا کھینچ تان کر پیش کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کا پیش کردہ مفہوم عربی لغت کے قاعدے قانون کے مطابق نہیں یا قرآنِ کریم کے سیاق وسباق اور اس کی کلی تعلیم کے متضاد ہے بلکہ اعتراض کی اصل وجہ یہ ہے کہ آپ کا بیان کردہ مفہوم مروجہ تراجم اور تفاسیر اور ان پر مبنی شریعت حقہ کے خلاف جاتا ہے۔ مثلاً آیۂ زیرِنظر کا مروّجہ ترجمہ ہے: اپنے عظیم ربّ کے نام کی تسبیح بیان کرو اور شریعتِ حقہ نے تسبیح بیان کرنے کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ ایک مالا لو اور اسے ہر نماز کے بعد جپا کرو۔ اگر مالا دستیاب نہ ہو تو یہ کام انگلیوں کے پوروں سے لو! اس کے برعکس، پرویز صاحبؒ اسی آیۂ کریمہ کا مفہوم یوں بیان کرتے ہیں: ''خدا کے ربوبیتِ عظمیٰ کے پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے سرگرمِ عمل رہو''!

یہ تو ذرا آگے چل کر بتایا جائے گا کہ آپ کا یہ مفہوم عربی لغت کے اعتبار سے کتنا صحیح اور قرآنِ کریم کی مجموعی تعلیم سے کس قدر ہم آہنگ ہے۔ پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ اس پر جو اعتراض کیا جاتا ہے، اس کی نفسیاتی وجوہات کیا ہیں؟ اسے ایک مثال سے سمجھئے: جب کوئی پرندہ پہلی بار جال میں پھنستا ہے تو انتہائی پھڑ پھڑاتا ہے۔ جال سے بھاگ نکلنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ اس لئے جو شکاری اسے سدھانا چاہتا ہے، سب سے پہلے اس کے پر کاٹ دیتا ہے۔ اس کے بعد ایک طویل اور مسلسل تربیت سے اس کی نفسیات یوں بدل کر رکھ دیتا ہے کہ پھر یہ از خود ہی اس کے چنگل سے نکلنا پسند نہیں کرتا، الٹا دوسرے پرندوں کو پھانسنے کے لئے استعمال ہوتا ہے___ ایسے پرندوں کو شکاری جب جنگل میں لے جاتا ہے تو وہاں کے آزاد باسی، کھلی فضا میں لمبی اڑانیں بھرتے، اِدھر سے اُدھر قلابازیاں کھاتے، آزادی کی سریلی تانیں الاپتے چہچہاتے، جھومتے، مٹکتے اسے بھی اپنے ساتھ مل جانے کی ترغیب دیں گے، لیکن یہ پر کٹا، مفت کے ٹکڑوں پر پلا ہُوا غلامانہ ذہنیت کا حامل جدھر سے مڑے گا سیدھا مالک کے قدموں میں! یہ اپنے ہی مرشد کے کاندھے پر سوار ہو کر یہ راگنی چھیڑ دے گا ؎

نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے، مجھے آرام بہت ہے

بعینہٖ یہی حال ہماری مذہبی پیشوائیت کا ہے۔ ان

بیچاروں کی نفسیات بھی برسوں کی ذہنی غلامی اور مفت کی روٹیاں توڑنے کی بنا پر ایک سدھائے ہوئے پنچھی کی طرح ہوگئی ہے، نہ کبھی اپنے ذہن سے سوچا! نہ کبھی اپنے ہاتھ سے کمایا! نہ تو آزادیٔ فکر کی نشاط انگیزیاں نصیب ہوئیں اور نہ سرگرمیٔ عمل سے لطف اندوز ہوئے! اسی لئے جب کوئی ایسا نغمہ چھیڑتا یا ایسا تقاضا کرتا ہے، جس میں آزادیٔ فکر یا سرگرمیٔ عمل کی بُو ہو، یہ سیدھے دوڑے، دوڑے اپنے آقاؤں کے قدموں میں سر رکھ دیتے ہیں۔

جب نبی اکرم ﷺ مبعوث ہوئے تو یہی حال اہل کتاب اور مشرکین کا تھا۔ ان کے احبار و رہبان نے بھی ایسی شریعت بنا رکھی تھی کہ جس میں عقل و بصیرت سے کام لینا اور زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے لئے جدوجہد کرنا قریب قریب حرام تھا۔ جنت کے حصول کے ایسے آسان اور تیر بہدف نسخے تجویز کرتے تھے، جن کا ہماری شریعت میں سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ اگرچہ یہاں بھی بخشش اور شفاعت کے کافی سبز باغ دکھا رکھے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ فریب نفس پیدا نہیں ہوسکا جو اہلِ کتاب کی احبار و رہبان نے اپنے دین میں پیدا کر رکھا تھا۔ وہ تو دھڑلّے سے کہتے تھے۔

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ (2:80)

ہمیں تو آگ چھو بھی نہیں سکے گی اور اگر جہنم میں جانا بھی ہوا تو یہ صرف چند دنوں کی بات ہوگی۔

ہماری مذہبی پیشوائیت کے راستے میں قرآنِ کریم مشکل پیدا کر دیتا ہے جو ابھی زندہ و پائندہ ہے۔ اس میں صاف صاف بیان ہے:

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (2:48)

''ہوشیار باش! اس دن ذلت و خواری سے بچنے کے لئے اپنی اپنی حفاظت کا سامان کرلو کیونکہ اس دن نہ ہی کسی کی سفارش کسی کے کام آسکے گی، نہ ہی کسی سے اس کے جرم کے معاوضہ میں کچھ (رشوت) لے کر اسے چھوڑ دیا جائے گا اور نہ ہی کوئی شخص، کسی مجرم کی مدد کو پہنچ سکے گا۔''

اگرچہ تنبیہات کی شدّت کو اپنی من مانی تاویلوں اور شرعی حیلوں سے کافی حد تک کم کرلیا گیا ہے۔ تاہم کلام اللہ کو نہیں چھیڑ سکے۔ اہل کتاب کے احبار و رہبان نے تو پورے کا پورا کلام اللہ بدل ڈالا تھا۔ اسی لئے تو انہیں بڑا عجیب لگتا جب حضور ﷺ، اللہ کی باتیں بلا آمیزش بیان کرتے۔ یہ باتیں ان پر بڑی گراں گزرتیں اور حیران ہوتے کہ یہ کیسا کلام اللہ ہے، چچا انتھونی [1] نے تو کچھ اور ہی بتایا تھا! اس کے جواب میں حضور ﷺ فرماتے ۔تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ (2:141)۔ وہ لوگ گزر گئے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ

(1) اہلِ کتاب کے احبار و رہبان کے لئے استعارہ۔

مَّا كَسَبْتُمْ (2:141) جو کچھ انہوں نے کیا، خود بھگتیں گے۔ تم اپنے اعمال کی فکر کرو! (2:141) جو اب میں پیش کر رہا ہوں۔ حقیقت یہی ہے۔ لہٰذا اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (2:170) اسی کا اتباع کرو! لیکن وہ اتنی سادگی سے ماننے والے کہاں تھے۔ چچا انتھونی نے جو افیون کھلا رکھی تھی، اس کا نشہ اتنی آسانی سے کیسے اُتر سکتا تھا۔ حضور ﷺ کی اس دعوت کے جواب میں بلا تامل کہہ دیتے۔ بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ (2:170) ہم تو اپنے سلفِ صالحین کے قدموں پر سر رکھنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ (2:170) آج جب دوبارہ قرآنِ خالص کی دعوت دی جاتی ہے تو ہماری مذہبی پیشوائیت کا بھی یہی رویہ اور یہی جواب ہوتا ہے۔

آباؤ اجداد کے آستانوں سے ہٹ آنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ اس گستاخی پر جو آتشِ نمرود بھڑکتی ہے یا ہیکل کی طعن و تشنیع کے جو زہر آلود تیر برستے ہیں، ان کا سامنا کرنے کے لئے ابراہیمؑ کی سی جرأت و بیبا کی، اور مریمؑ کی سی ہمت اور حوصلہ چاہئے۔ یہ وہ اوصاف ہیں جو انسان کو شرفِ انسانیت کی بلندیوں پر فائز کر دیتے ہیں۔ ان کے سامنے ہر آتشِ نمرود ٹھنڈی پڑ جاتی ہے اور انسان ہر طرح کے طوق وسلاسل اتار پھینکتا ہے۔ لیکن یہ جرأت و بیبا کی، یہ حوصلہ و عزم اتنی آسانی سے نہیں پیدا ہوتا۔ نہ ہی اسے دنیا کی کوئی تعلیم یا شریعت یا طریقت پیدا کر سکتی ہے۔ آج ہم فکر و عمل کی جن پستیوں میں گرے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم کلام اللہ سے بہت دُور ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کی آیات محفوظ ہیں، اس کے الفاظ میں کوئی ردّ و بدل نہیں ہوا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اسے ہم اپنی زندگی کی عزیز ترین متاع سمجھتے ہیں۔ اس کے تقدس واحترام میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ ہماری ذلت وپستی کی یہ وجہ نہیں، دراصل ہم نے اس کی آیات کا مفہوم بدل ڈالا ہے۔ ان میں حرارت وتوانائی کے جو شرارے تھے، وہ بجھا دیے ہیں۔ ان کی اثر انگیزی کو نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

ہمارے مروّجہ تراجم وتفاسیر میں قرآنِ کریم کی آیات کا یہی حشر کیا گیا ہے۔ وہی آیات کہ جن کو پڑھ کر ذہن کے سوتے پھوٹ پڑیں، رگوں میں بجلیاں کوندیں، دل مستانہ وار کچھ کرنے کو چاہے اور زندگی بہار کی طرح کھل اُٹھے۔ ان تراجم وتفاسیر میں یوں بیان کی جاتی ہیں۔ جسے پڑھ کر عقل روئے اور عشق ماتم کرے۔ انسان درخت کے پتوں کی طرح اِدھر اُدھر لڑھکتا رہتا ہے۔ انہی آیات کے حامل ایسے لوگ بھی تھے جن کے بارے میں اقبالؒ نے کہا تھا۔

توڑ ڈالیں جن کی تکبیریں طلسمِ شش جہت!

آج انہی آیات کے حامل تکبیریں پڑھتے ہیں لیکن تنکا بھی نہیں ٹوٹتا۔

اس ملی ضعف کے ذمہ دار یہی تراجم وتفاسیر ہیں۔ ان میں قرآنی آیات کے مفہوم بدل دیئے گئے ہیں اور ایک مفہوم کے بدلنے سے انسان کی پوری نفسیات بدل جاتی ہے۔ نفسیات بدلی تو انسان کا سب کچھ بدل جاتا ہے۔ اس کی سوچ، اس کی بصیرت، اس کا عمل، اس کی سیرت ــــ سب میں نمایاں تبدیلی آجاتی ہے۔ یہی چیز ہر انسان کے

خارجی ماحول پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی لئے خدا نے بھی کہا ہے کہ:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ (8:53)

ہماری نعمتوں میں اس وقت تک تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔

حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ (8:53)۔

جب تک کہ کوئی قوم اپنی نفسیات نہ بدل لے۔

اگر نفسیات خدا کے احکام کے تابع بدلے تو نعمتوں کی فراوانی ہوجاتی ہے۔ اس کے برعکس نعمتیں چھن جاتی ہیں۔ ان تراجم و تفاسیر میں قرآنی احکام کی اثر انگیزی کو کس طرح ختم کیا گیا ہے۔ ان کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

کہا، اعلان کرو۔ لا الہ الا اللہ۔ اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں ہوسکتا! یہ انسان کی آزادی کا عظیم ترین اعلان تھا۔ آزادی کے اس عظیم تصور سے دلوں میں جوش وولولہ کے فوارے پھوٹ پڑتے ہیں۔ دنیا کا ہر جابر ومستبد اپنے جیسا عام انسان لگتا ہے۔ نہ کسی کا خوف دامنگیر رہتا ہے اور نہ کسی کا جاہ ومنصب مرعوب کرسکتا ہے۔ خدائے برتر وعظیم کے سامنے ایک سجدہ انسان کو ذلت وخواری کے ہزار سجدوں سے نجات دلا دیتا ہے لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت آگے بڑھی۔ انہی الفاظ کو ذکرِ الٰہی کے سانچے میں ڈھال لیا اور چونکہ ان کا تعلق دل کے جوش وخروش سے تھا لہٰذا حکم دیا کہ اس ذکر سے دل پر ایسی ضربیں لگاؤ کہ یہ بالکل مردہ ہوجائے۔ لا اِلٰہ کا مفہوم بدلا، نفسیات بدل گئی! اب وہی آواز جو کاخِ اُمراء کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیتی تھی، آج اس مسجد کے تنکوں کو بھی نہیں ہلا سکتی، جہاں بیٹھ کر یہ بلند کی جاتی ہے۔ کاخِ امراء کے در و دیوار خاک ہلیں گے، جبکہ خود اہلِ زبان، اِدھر مسجد میں لا الہ الا اللہ کے نعرے لگائیں گے اور جیسے ہی فارغ ہوں گے، سیدھے بادشاہ کے قدموں میں جا بیٹھیں گے!

ایک اور مثال لیجئے! اللہ تعالیٰ نے انسان سے کہا، تمہیں جنت چاہئے تو آؤ میرے ساتھ معاہدہ کرو اور معاہدے کی شرط یہ ہے کہ تم اپنا جان و مال میرے نام لکھ دو، میں اپنی جنت تمہارے نام لکھ دیتا ہوں (9:111)

بڑی سیدھی سی بات تھی، صاف ستھرا سودا، ہر جھنجھٹ سے نجات! کون ہندوؤں کی طرح عمر بھر اشنان کرتا رہے ماتھے ٹیکتا رہے اور نہ جانے کن کن عقائد ورسومات کے شکنجوں میں اپنے آپ کو جکڑ کر بھی مکتی کا یقین حاصل نہ کرسکے۔ یا پھر ہمہ وقت یہ کھٹکا کہ آیا سر پر ٹوپی رکھی ہے، ہاتھ صحیح جگہ بندھے ہیں، کہیں قضا تو نہیں ہوگئی وغیرہ وغیرہ، یہ سیدھا سادا سودا ہے۔ مذہبی پیشوائیت نے کہا۔ اتنی آسانی سے کیسے چھوٹ سکتے ہو۔ اگر تمہیں فکر وعمل کی آزادی دے دی گئی تو پھر ہماری روٹی کا بندوبست کون کرے گا! اللہ میاں نے جو کہا ہے اس کی بس تلاوت کیا کرو، اور خیال رکھو کہ ان آیات کی بے حرمتی نہ ہونے پائے۔ باقی رہا عمل تو اس کے لئے شریعت ہے۔ اس کے بغیر جنت میں داخلہ نہیں ملے گا! اللہ میاں نے یہ تو بتا دیا ہے کہ جان و مال کے بدلے جنت مل جائے گی لیکن یہ تو نہیں بتایا کہ اس کے دروازے کی

کنجی کہاں ہے اور پھر روزہ داروں کے لئے جو مخصوص دروازہ ہے، اس کا نام و پتہ تمہیں کون بتائے گا، لہٰذا ان معلومات کے لئے بالآخر تمہیں ہماری ہی طرف آنا پڑے گا۔ نفسیات بدل گئی! جان و مال کا سودا بھلا دیا اور صرف صوم وصلوٰۃ کے پابند ہو گئے۔ جان و مال کا سودا، کسی انسان کے لئے زندگی کی تگ وتاز میں سب سے آگے رہنے کا موجب ہوتا ہے، اسے چیتے کا جگر اور شاہین کی جھپٹ عطا کرتا ہے! اس لئے کہ اس نے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی تھی۔ یہی سودا انسان کو شاخِ ثمر دار کی طرح ہمیشہ جھکائے رکھتا ہے کہ لینے والے کو ایڑی بھی نہ اٹھانی پڑے، اس لئے کہ اس نے اپنی محنت کے ماحصل کو بھی اسی عظیم ہستی کے نام لکھ دیا تھا۔ ایک ہاتھ سے کماتا، دوسرے ہاتھ سے دیتا اور ہر لین دین پر جھوم جھوم جاتا اور یہ سب اس لئے کرتا کہ اس نے جنت حاصل کرنی تھی۔ آج بھی وہ جنت کے لئے دوڑ دھوپ کرتا ہے لیکن یہ دوڑ زیادہ سے زیادہ مسجد تک ہوتی ہے، کبھی کبھی مال بھی دے دیتا ہے لیکن اس وقت کہ جب بچ نکلنے کی کوئی راہ دکھائی نہ دے، جیسے بنک کٹوتی! اور جب جان دینے کا موقع آتا ہے، تو یہ چھت پر چڑھ کر اذانیں دینا شروع کر دیتا ہے! ایسی ہی شخصیت کو دیکھ کر اقبالؒ نے کہا تھا۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

اللہ کے تابع فرمان نہ چلنے والے مسلمان کی اس سے بہتر تصویر کشی اور نہیں ہو سکتی۔ آپ سارے معاشرے میں نگاہ دوڑا کر دیکھ لیجئے۔ بہت کم ایسے لوگ نظر آئیں گے جو ان تینوں کے جال سے باہر آزاد فضا میں چہک رہے ہوں گے۔ ایک اکثریت تو حکامِ بالا کے قدم چاٹتے نظر آئے گی۔ کچھ ملاؤں کی ٹامک ٹوئیوں میں پڑے ہوں گے اور دوسری اکثریت حضرت صاحب کے قدموں کی خاک بوسی کرتے ہوئے ملے گی۔ اب آگے بڑھیئے، اور قرآن کے بلند اصولوں کو جس طرح پامال کیا گیا ہے۔ اس کی تیسری مثال ملاحظہ فرمائیے۔

اللہ تعالیٰ نے انفاق کی فضیلت نہایت نکھار کر بیان کی ہے۔ کہا، اس سے معاشرے کی ناہمواریاں دُور ہو جائیں گی (2:271) ایسے خوبصورت اور ایسے نفع بخش عمل کو کس کا جی نہیں چاہے گا کہ اختیار کرے۔ اسی لئے، ان خوبیوں کو سنتے ہی زبان پر بے ساختہ سوال آیا۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۥ (2:219) اے رسول! یہ انفاق کی خوبیاں سن کر بیتاب ہو گئے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ بتائیے ہم کتنا انفاق کریں۔ قُلِ الْعَفْوَ ۭ (2:219) ان سے کہو کہ جو کچھ تمہاری ضرورتوں سے زائد ہو سب کا سب وہ جو یہ سوال کرنے میں مخلص تھے، نہایت خوشی خوشی لوٹے اور بلا چون وچرا اس پر عمل پیرا ہو گئے۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ۝ (53:33) کیا تو نے ان کی حالت پر بھی غور کیا، کس طرح خدا کے وضع کردہ معیار سے روگردانی کی۔ ان سے کہا یہ گیا تھا کہ تم اپنے مال کو نوعِ انسان کی ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھو کیونکہ جس قدر تم دوسرے انسانوں کی نشوونما کے لئے دو گے، تمہاری ذات کی

نشوونما اتنی ہی زیادہ ہوگی لیکن یہ کرتے کیا ہیں کہ وَاَعْطٰی قَلِیْلًا وَّاَکْدٰی ﴿۳۴﴾ (53:34) تھوڑا سا دیا اور پتھر کی طرح سخت ہوگئے۔ اس کے بعد ہمارے مذہبی پیشوا آئے۔ انہوں نے کہا۔ اللہ میاں بھی کیا سادگی سے فیصلے کرتا ہے، ایک ایک، دو دو لفظوں میں دنیا کے صدیوں پرانے اور مستحکم نظام تہس نہس کر رہا ہے۔ ایک ''العفو'' کہا اور اِدھر کا مال اُدھر، سرمایہ داری کے سارے نظام کا ستیاناس! واضح رہے کہ سرمایہ داری نظام کی پوری عمارت زائد از ضرورت مال پر استوار ہے۔ اس بنیاد کو ہلا دیں، ساری عمارت دھڑام سے نیچے آ گرے گی۔ انہیں، اَعْطٰی قَلِیْلًا وَّاَکْدٰی، کی پالیسی کا علم تو تھا لیکن اس پالیسی کو بلا دلیل یا جواز کے اختیار نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دائرۂ اسلام میں رہ کر یہ کوئی کام بھی بلا دلیل نہیں کرتے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے اکثر دلائل بے وزن اور بے تکے ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے کیا کیا دلائل و براہین پیش کئے ہیں، ذرا کسی عالم دین سے یہ پوچھ کر دیکھ لیجئے کہ قرآن کریم کے اس قدر واضح احکام اور سخت وعیدوں کے باوجود زائد از ضرورت مال کو روک رکھنے کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے، تو پھر سنیئے، صاحبِ تفسیر، صاحبِ شریعت، صاحبِ حدیث کیا کیا خوبصورت دلائل دیتے ہیں۔ ایسے واقعات اور ایسی احادیث بیان کی جائیں گی کہ آپ اپنا سامنہ لے کر رہ جائیں گے اور آئندہ ایسا سوال کرنے کی گستاخی نہیں کریں گے۔ آپ کیسے لاجواب نہیں ہوں گے جبکہ ہمارے مفسروں، محدثوں اور عارفوں نے اپنا سارا زورِ قلم انہی آیات کے مفہوم کو بے اثر کرنے پر صرف کیا ہو۔ یہ جو آج ان کے اتنے گُن گائے جا رہے ہیں، بظاہر اس کی وجہ کچھ سہی، نفسیاتی طور پر یہ اس اطمینان وسکون کی جھلک ہے جو بے حد و نہایت دولت اکٹھی کرنے کی اجازت سے ہوتا ہے: یہی وجہ ہے کہ آج ان کے متبعین ہر اس شخص کی جان کے لاگو ہو جاتے ہیں جو ان آیاتِ کریم کا خالص اور بلا آمیزش مفہوم پیش کرتا ہے۔ جب انہیں اللہ تعالیٰ کی یہ وعید سنائی جاتی ہے ــــ اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ﴿۲﴾ (104:2) جس نے بھی مال جمع کیا اور گن گن کر رکھا ــــ کَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ (104:4) اسے اٹھا کر جہنم میں جھونک دیا جائے گا جو اسے پاش پاش کر کے رکھ دے گی۔ تو یہ سنتے ہی تلملا اُٹھتے ہیں۔ ایسے کہنے والوں کو مادہ پرست، دہریہ، ملحد، کارل مارکس کا چیلا اور نہ جانے کن کن طعن و تشنیع کے نشتروں سے چھلنی کرتے ہیں۔ ان کی ایک ہی چیخ و پکار ہوتی ہے کہ قرآن کا مفہوم خواہ کچھ ہو، خبردار! جو ہمارے بزرگوں کے بارے میں کچھ کہا۔ انہوں نے جو مفہوم لیا ہے، وہی صحیح ہے۔ ان سے زیادہ راست باز اور عقلمند کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ ان کے اس پر زور اصرار سے کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ان کے بعد اپنی آئندہ مخلوق پر عقل و فراست کے دروازے بند کر دیئے ہوں۔ بہرحال، ہم تو یہ دلدوز کہانی سنا رہے تھے کہ قرآن کا مفہوم کیسے بدلا۔

مرثیہ کیوں؟

آپ گھر میں ہوں یا دفتر میں، بازار میں ہوں یا دکان پر، ریل پر ہوں یا بس میں، تانگے میں ہوں یا میٹرو پر، بارات میں ہوں یا جنازے کے ساتھ — جہاں کہیں دو مسلمان جمع ہوں وہ مسلمانوں کی عام حالت کے مرثیہ خواں نظر آئیں گے۔

پہلے تو صرف اتنا ہی کہا جاتا تھا کہ قوم میں سخت اَفلاس ہے۔ لوگوں کے پاس کھانے کو روٹی، پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان نہیں۔ بیمار پڑ جائیں تو دوائی نہیں اور مر جائیں تو کفن دفن تک کے لئے پیسے نہیں۔ اب اس کے ساتھ اس کا بھی اضافہ ہوتا ہے کہ لوگ بددیانت ہیں، بے ایمان ہیں، چور ہیں، جھوٹے ہیں۔ بلیک مارکیٹ، رشوت، نفع خوری، اعزّہ پروری اور اَقربا نوازی عام ہے۔ افراد سے آگے قوموں تک جایئے تو مسلمانوں کا تقریباً ہر ملک تباہ حال ہے۔ عوام میں جہالت اور غربت ہے، خواص خائن اور غدّار ہیں۔

یہ مرثیہ تو عام ہے لیکن کوئی یہ نہیں بتاتا کہ اس کی آخر وجہ کیا ہے؟

مسلمان کیوں ہر جگہ پستی اور ذلت میں ہیں؟

اگر آپ کو اس سوال سے دلچسپی ہے تو آپ یہ کتاب ضرور دیکھئے جس کا نام ہے:

اَسبابِ زوالِ اُمّت

کمپیوٹر کمپوزنگ اور کتابت کا حسین اِمتزاج | طباعت کا اعلیٰ ترین معیار

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) 25-بی، گلبرگ 2، لاہور
tolueislam@gmail.com ; www.islamicdawn.com
www.facebook.com/tolueislam.trust
Phone: +92 42 35753666

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بچوں کا صفحہ

سنی سنائی بات پر عمل نہ کرو

شرجیل کے ابا دفتر سے واپس آئے تو انہوں نے دیکھا کہ شرجیل صحن میں اکیلا بیٹھا ہے اور کچھ اُداس سا ہے۔ انہوں نے پوچھا:

''بیٹا! آج تم اکیلے کیوں ہو؟ کیا مزمل کھیلنے کے لئے نہیں آیا؟''

پہلے تو شرجیل نے کوئی جواب نہ دیا لیکن باپ کے اصرار پر ان دونوں میں یہ گفتگو ہوئی۔

شرجیل: ''وہ آیا تو تھا لیکن میں نے اس سے کہہ دیا کہ تم یہاں نہ آیا کرو۔ میں تم سے کبھی نہیں بولوں گا۔''

شرجیل کے ابا: ''کیوں بیٹا! کیا بات ہوئی۔ مزمل تو بہت اچھا لڑکا ہے۔''

شرجیل: ''نہیں ابا جان وہ اچھا لڑکا نہیں ہے وہ بڑا خراب لڑکا ہے۔ میں اس سے کبھی نہیں بولوں گا۔ میں اُسے یہاں نہیں آنے دوں گا۔''

شرجیل کے ابا: ''ایسی کیا بات ہوئی ہے جس سے تمہیں معلوم ہوا کہ وہ خراب لڑکا ہے۔ وہ تو تمہارا پرانا دوست ہے۔''

شرجیل: ''میں بھی اُسے ایسا ہی سمجھتا تھا لیکن آج نثار نے مجھ سے کہا کہ مزمل تمہارے خلاف سکول میں بُری بُری باتیں کہتا رہتا ہے اور لڑکوں سے کہتا ہے کہ وہ نہ تمہارے ساتھ بولیں اور نہ کھیلیں۔''

شرجیل کے ابا: ''بیٹا! تم نے مزمل سے یہ بات پوچھی ہے یا دوسرے لڑکوں سے معلوم کر لیا ہے کہ نثار سچ کہتا ہے؟''

شرجیل: ''نہیں ابا جان! میں نے کسی سے نہیں پوچھا۔ نثار نے مجھے تاکید کر دی تھی کہ اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرنا اور کرنا بھی تو میرا نام ہرگز نہ لینا۔''

شرجیل کے ابا: ''بیٹا! یہ تو بُری بات ہے کہ تم بغیر تحقیق کئے کسی کے متعلق ایسی رائے قائم کر لو۔ خدا کا حکم ہے کہ محض سنی سنائی بات پر عمل مت کرو۔ جب تک تم کسی بات کی خود تحقیق نہ کر لو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔''

اس پر شرجیل خاموش ہو گیا۔ شام کے وقت اس کے ابا نے مزمل کو بھی بلایا اور پھر اسکول کے دو ایسے لڑکوں کو بھی جو شرجیل

اور مزمل کے دوست تھے۔ ان سے بات کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ نثار نے یہ سب جھوٹ کہا ہے۔ کسی بات پر اس کی مزمل سے لڑائی ہوگئی تھی اور اس نے شرجیل اور مزمل میں پھوٹ ڈالنے کے لئے ایسی غلط باتیں شرجیل سے کہیں۔

اس پر شرجیل کے ابا نے اس سے کہا: ''دیکھا بیٹا! خدا کے اس حکم پر عمل نہ کرنے سے کتنا نقصان ہوا۔ اب جب کہ تمہیں معلوم ہوگیا ہے کہ مزمل نے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی تو تمہیں چاہئے کہ تم اس سے معافی مانگو۔''

چنانچہ شرجیل نے مزمل سے معافی مانگی اور آئندہ کے لئے وعدہ کیا کہ وہ جب تک کسی بات کی تحقیق نہیں کرلیا کرے گا اس پر یقین نہیں کرے گا۔ پھر شرجیل اور مزمل دونوں خوشی خوشی کمرے میں کھیلنے لگے۔

پرویز صاحب کی آخری اپیل

آخر میں، میں اپنی اُس مخلصانہ اپیل کو ایک بار پھر دہراؤں گا، جسے میں ہر سال آپ کی خدمت میں پیش کیا کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ:

1۔ اپنے ذہن میں کسی غیر قُرآنی تصور و خیال کو جاگزیں نہ ہونے دو۔

2۔ اپنے قول سے ہی نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی ثابت کرو کہ قُرآن کی تعلیم انسان کو کس بلند مقام پر لے جاتی ہے۔

3۔ قُرآنی فکری نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دو۔ لیکن جو کچھ کرو خالصۃً بوجہ اللہ کرو۔ اس میں کسی ذاتی مفاد یا جذبہ کو دخل انداز نہ ہونے دو۔

4۔ آپ سے کسی قسم کی کوئی حرکت ایسی سرزد نہ ہونے پائے جس میں فرقہ پرستی یا پارٹی بازی کا شائبہ تک بھی پایا جائے۔ اپنے دامن کو ان خاردار جھاڑیوں سے قطعاً نہ الجھنے دو۔

5۔ اپنے وقت اور توانائی کو، ضدی طبقے کے ساتھ بحث و تمحیص میں ضائع نہ کرو۔ قُرآنی تعلیم کو صرف اُن لوگوں کے سامنے پیش کرو جو علم و بصیرت سے سمجھنے اور سنجیدگی سے اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہوں۔

6۔ ہر رات سونے سے پہلے یہ سوچو کہ آپ نے۔

(i) دن بھر میں قُرآنی احکام و تعلیم کے خلاف تو کوئی کام نہیں کیا۔ اور

(ii) آپ نے کسی دُکھی انسان کو سکھ پہنچانے کے لئے کیا کیا ہے۔ یاد رکھئے! انسانیت کی بے لوث خدمت، بلند ترین مقصد زندگی ہے۔

7۔ اور آپس میں محبت اور پیار اور مُودّت و الفت کے ساتھ رہو، کہ دنیا میں قُرآنی رشتے سے زیادہ پاکیزہ اور گہرا رشتہ اور کوئی نہیں۔

پرویزؔ

اللہ آپ کو خوش و خرم رکھے اور آپ کے عزائم کو کامیابی عطا فرمائے۔ (والسلام!) (''منزل بہ منزل''، صفحہ: 181)

قرآنی پمفلٹس

صحیح قرآنی فکر کو عام لوگوں تک پہنچانے میں قرآنی فکر پر لکھے گئے چھوٹے پمفلٹس نے بھی بہت ہی اہم اور کامیاب کردار ادا کیا ہے۔ احباب اِن پمفلٹس کا خود بھی مطالعہ کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو تقسیم بھی کرتے ہیں اس لئے اِن کی قیمت اصل لاگت سے بہت ہی کم رکھی جاتی ہے۔ جبکہ کچھ صاحب ثروت احباب اِس کمی کو اپنے عطیات سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں چونکہ یہ سلسلہ ابھی بھی محدود پیمانے پر جاری ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ اِس سلسلہ کو مزید بہتر کیا جائے لہٰذا صاحب ثروت حضرات سے مزید عطیات کی درخواست کی جاتی ہے کہ وہ قرآنی فکر کے کام میں مزید وسعت پیدا کرنے میں ہماری مدد کریں اور اپنے عطیات ''پمفلٹس فنڈ'' کے لئے بھجوائیں تاکہ پمفلٹس کی طباعت اور دوسروں تک قرآنی فکر کو پہنچانے میں ہم کامیابی حاصل کرسکیں۔

ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات کی کل آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف ہوتی ہے

رقم بذریعہ منی آرڈر۔ بینک ڈرافٹ بنام ادارہ طلوع اسلام 25-B گلبرگ 2، لاہور ارسال فرمائیں۔
بینک اکاؤنٹ کی تفصیل پہلے صفحہ نمبر 2 پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 10 روپے علاوہ ڈاک خرچ

اسلام آگے کیوں نہ چلا	قرآن مجید کے خلاف گہری سازش	دوقومی نظریہ
اسلام کیا ہے؟	قربانی	عورت قرآن کے آئینے میں
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	قیامت موجود	پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
اسلام اور مذہبی رواداری	قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر	تحقیق ربوٰ (مسئلہ سود)
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
اسلامی آئیڈیالوجی	ہندو کیا ہے؟	بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)	ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح)	تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّی کسے کہتے ہیں
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	ہماری تاریخ میں کیا ہے؟	روٹی کا مسئلہ
اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز)	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
انسانیت کا آخری سہارا	ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	نماز کی اہمیت
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری	مقام اقبالؒ	ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اقبال کا مردِ مومن	مقام محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم	علماء کون ہیں؟
اندھے کی لکڑی	مرزائیت اور طلوع اسلام	فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
آرٹ اور اسلام	ماؤزے تنگ اور قرآن	کافرگری
قرآن کا معاشی نظام	مومن کی زندگی	حرام کی کمائی
قرآن کا سیاسی نظام	جہاں مارکس ناکام رہ گیا	عالمگیر افسانے

***Manzil ba Manzil* (منزل بہ منزل)**

Chapter 3: Spring's Message (*Payam-e Fasl-e Bahar* پیام فصل بہار) –
Message to Fellow-Ambassadors

Episode No. 1

(Tulu-e-Islam Convention, November, 1959)
By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam)

In the lovely garden, spring's magic is in the air;
Birds are singing; what an enthralling atmosphere?
Bring out whatever is hidden in your heart and soul;
Sublime music, sweet song, deep sigh, and loud call!

Dear Brothers, *Assalaamu Alaikum wa Rahmatullah*!

By the Grace of Allah this spring caravan that started gently like the morning breeze about two and half years ago, fearlessly passing through dangerous terrain and terrifying valleys; avoiding sensational attractions and enchanting temptations; undaunted by mighty obstacles; intensely focused; deeply passionate to reach its destination like a spinning cosmic galaxy but devoted to terrestrial green pasture – has, by now, step-by-step, reached a place where the entire atmosphere is echoing with the sounds of the Quranic message, and every individual is saying to the caravan leader:

The days are long past that you were alone in the crowd;
There're now many a confidantes of yours, in the crowd!

My dear friends, you have propagated the Quranic message with so much enthusiasm and with such a deep passion, that in a short time, its effects are being felt in all the corners of the country. The country is buzzing with the Quranic echoes.

Birds' chirping has breathed intense spirit in the garden;
Otherwise, every bud was absorbed in its own daydream!

Changing the dates of the convention

Although the intention for changing the dates of the convention was weather, but it seems that subconsciously, it was also to align with the changes taking place in your world of thoughts and ideas, and with the cosmic forces of nature. The arrival of spring is a call to life from every corner of the world: seemingly dead trees become alive; dead foliage turns into green pasture; new plants sprouting out from rocky barren fields; blooming flowers create colorful tapestry all around. It is as if to announce to the whole world: فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ (30:50) – Behold, then, these signs of Allah's grace - how He gives life to the earth after it had been lifeless! Just contemplate on the effects of Allah's Law of Sustenance, which gives life to earth after it had been lying dead.

Spring rain falling around the tent and swelling the mountains and valleys;
Thousand rapturous melodies arise
Of parrots, francolin, and starling;
All around streams flowing;
Fields full of colorful flowers
Has brought show for the eyes;
Spring rain falling around the tent and swelling the mountains and valleys;
Has brought caravan of flowers and opened the gates of orchards and slope!
Has blown the spring breeze;
Has created new sound of birds;
Has torn the collars of flowers;
Has plucked their fresh beauties;
The love has bought the sorrows;
Has brought caravan of flowers and opened the gates of orchards and slopes!

Desire for new life

My dear friends, it seems the cosmic laws subconsciously influenced you to change the time of the convention and led you to erect your tent in the season of spring so that you can say to your Sustainer: Now that we have seen Thou creation of new life in the external life, our wish is to know the secret to create new life in a dead people. رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ (2:260) – Please tell us: "What is the process by which new life may be infused into a dead nation?" O our Sustainer, show us how to create new life into dead hearts? This is the center of our circle of wish for which we have gather here together; and this is the question for whose answer we have spread our begging bowl to our Sustainer who has proclaimed openly: اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ (2:186) – when anyone calls upon Me to lead him to the right path, My Guidance which is preserved in the Quran, answers his call. But to get the reply from His guidance, certain prerequisites are required: (1) One needs to have true and sincere desire in one's call; (2) one needs to have deep passion and intensity in his wish; and (3) one needs to have the mental ability to understand His guidance. When the seeker wants to seek answers after having achieved these prerequisites, then this Book welcomes him with its open arms.

The Sunrays are themselves longing with inner desire to launch;
Otherwise, the reality of the flight of dewdrop is too well known!

Fortunate are those nations, who, along with deriving material benefits from

the external universe also search for the welfare of their inner world, the world of heart and soul: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ (13:29) – Those who believe and wish to have a heart free of worry, tell them that this can only be achieved by keeping Allah's laws constantly in mind. Those who believe in Allah in such a manner and act righteously shall have blessings of all kinds and shall live a most beautiful and balanced life.

***

Revolution and martial law

After we met last time, in October 1957, there has been a change in the world of thoughts and ideas; but even more important, there has been a change in the external world, i.e., in the state of Pakistan. Those who have only a simplistic view of the political chessboard may not fully appreciate the real significance of this change. But those with ability to go beneath the surface know that behind this change is the working of the cosmic forces of nature. These are the forces which are normally referred to as the demand of the time. And, the demand of the time is saying loud and clear that:

The old game of political craftsmanship is debasing;
The earth is fed up with rule of Sultan and despots;
Capitalism's reign of horror is past; its age is gone;
The magician has shown his magic show, and gone!

The world knew this but we were sleeping cozily under the blanket woven by warp and woof of capitalism and priesthood. If we had continued any further then the flood of communism would have landed with its full fury, and would have swept all our values and ideologies like straws and hays. But, before this flood could land, we pushed aside the political and selfish forces of capitalism by the wayside; and started instituting land reform.

Land reform

As far as land ownership according to the Quran is concerned, there is considerable literature available on this issue from Tulu-e-Islam. Therefore, there is no need to go into details here. As you know, there is no question of individual or collective ownership of land in Islam. The concept that the Quran has given about its economic system is this:

1. The Earth is the source of sustenance for all humankind.
2. It is the duty and responsibility of the Islamic government to provide the basic needs of life to all human beings. That is, the Islamic government cannot just say that it will *try* to fulfil this promise but that it *must deliver* on this promise. This duty *must* be the justificatory reason for its existence. The Quran openly and clearly proclaims: الَّذِينَ

(22:41) – If اِنۡ مَّكَّنّٰهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَهَوۡا عَنِ الۡمُنۡكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الۡاُمُوۡرِ ۝ We bestow on them the authority to rule and they do come into power, they will establish the order Salah (so that everyone in society follows the system of Divine Laws). They will provide means of development to each and every one and enforce Laws which are in conformity with the Divine Code (the Quran); and forbid people from doing anything that is contrary to it. In other words, in every case they will first look for the guidance given by Allah's Law; and then after discussion and consultation decide their affairs according to the Divine Law.

3. It is clear that Islamic government cannot fulfil this responsibility unless the sources of sustenance are within its control.
4. Therefore, according to the Quran, the land and other sources of production must necessarily remain under the control of the government. But, contrary to this Quran's clear guideline, our Sharia – developed by our religious priesthood under the auspices of kings and autocratic dictators – says that private ownership of land is allowed without any limits; and that the government does not have any right to impose any restrictions on private ownership of land, let alone declare it illegal. But, it is heartening to note that the report of the land reform commission, set up by the martial law government, recognizes that there cannot be private ownership of land.

Land reform commission's report

> It says that, from the point of view of the landlords, putting any limitation on the ownership of land is extraordinary event. They think that doing this is equivalent to communism and therefore against Islam. In saying this they do not take into account that there are four Islamic countries – Egypt, Syria, Iraq, and Turkey – that have placed limitation on land ownership. They say that why single out land and not put limitation on ownership of other kinds of wealth such as ownership of industries and factories. [Report pp.25-26]

Well, my friends, you are not unaware that this kind argument is not the product of the mind of the landlord. This has been handed to them by our custodians of religion [Maududi, *The issue of Land Ownership*]. Anyway, this was a side issue. The report continues:

> The landlord must always remember that the any ownership of land is not absolute. [Page 26]

To clarify this point the report continues regarding "compensation for the land":

> On the issue of the ownership of the land we mentioned that private ownership of the land cannot be full and absolute because the government has the right of taxation. Theoretically, the government could increase the tax so much that there is nothing left for the owner. Therefore, if the government does not give anything in return for it acquiring the land from the private owner then it cannot be held against the basic concept of ownership of the land in light of the above argument. [Page 43]

Do you see my friends, how the commission's research conclusion is closer to the basic concept of the Quran regarding land ownership. History tells us that during the period of Caliph Umar (R) the government acquired land without paying any compensation to the owner. Also, anyone who accepted Islam, his land automatically went under the control of the government. From this you can see that the land reform commission's decision limiting private ownership of land is a bold step in the direction of Quran's economic system.

The size of land area

> The limit on the size of land area that has been recommended for private ownership by the land reform commission is too large according to some, including one of its members. In this regard, the commissioners say that we have taken various factors into account in setting this limit, not the least being that a drastic reduction might cause undue hardship to some. [Page 29]

From this it is clear that the government wants to reach its goal slowly and gradually. That is:

It is not that there is any shortage of tears;
It is just to be kind to the size of the sleeve!

From this it could be hoped that if the government keeps moving in this direction, then, step by step, it will reach the Quran's goal: that not only the land but all other sources sustenance eventually must come under the control of the Islamic government, which, then, becomes responsible for meeting all the basic needs of the people. This is called the system of universal sustenance which is the realization of Allah's attribute (within human limitation) of being the Sustainer of all the worlds: رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1). And those who carry this out, proclaim to the whole world: صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۖ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ (2:138) – We have acquired color (harmony) with the Divine Laws. Say: "This is the best way and this is the way we have chosen for ourselves."

Humanity's salvation and wellbeing

Did you notice, my friends, how Allah's cosmic forces have been taking the

world in the right direction. The reality is that the road for humanity's salvation and wellbeing cannot be but the one given by the Quran as determined by its permanent values. The world can try other roads as best as it could, but, after all its failed experiments, it will have to eventually come to the road which the Quran has prescribed, and on which the footsteps of that most sublime and greatest personality (PBUH) are resplendent like shining stars; and, who, by walking on that road, carried the humanity to its destination – humankind's ultimate dignity. History bears testimony to the fact that the direction of every humanistic revolution that happened in the last 1400 years was in that direction; and that every right revolution that will happen in future will also point in that same direction that was shown by the Prophet (PBUH):

Vision's light, mind's stars, mark of aching heart;
Wherever light is, it has come from the same source!

Mullahs and Sufis

But whereas this reality is enormously glad tiding to humanity, that after every failed experiment it has always come to the goal as determined by the Quran, it is also quite strange and extremely painful to observe that the greatest opposition and the biggest hindrance to the Quran has come from our own religious establishment.

What a revolution took hold of a town;
Drunkards are awake; pious ones asleep!

But this is nothing new. The Quran has warned Muslims is clear-cut words: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (9:34) – O People who believe! A good many of the Sufis and Mullahs devour others' property and turn them away from Allah's path. Human history as well as the past history of Islam is witness that nonbelievers and agnostics have not been as successful in turning people away from Allah's path as much as those who claim to invite people to His path but in fact they are the biggest hindrance in its way.

Falsehood in the garb of truth

The reason is obvious. If falsehood comes out in its true color then it will never succeed. It is necessary that it should come in the garb of truth in order to succeed: A person comes to you and tries to convince you to do something. You are convinced; and you promise to do it. But just before leaving he tells you that whatever he said was false. Tell me, would you keep the promise you made to him? You won't. The only way you will do it if until the end he keeps insisting and swearing that whatever he said was true. It is clear from this that

for falsehood to succeed it must appear in the garb of truth. This is precisely the reason that those who want to prevent you from following the path of Allah come to you wearing the garb of facilitating the path of Allah. This is the only way they can succeed in their mission of falsehood – to come to you wearing the garb of truth. This is the reality which the Quran has pointed out about these people's technique in misleading people: فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۗ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (2:79) – These people practice deception not only on others but also amongst themselves. The illiterate ones amongst them do not know what Allah has revealed and refer their questions about the Sharia to their religious leaders. The latter frame the Laws of the Sharia themselves but tell the former that these Laws are Divine. Thus they deceive others just to secure a paltry price for it, not realizing that their fabrication of the Sharia and their use of it as a means of livelihood will bring about their ruin.

If they said that the Sharia they have concocted is from their own and is not the order of Allah, then no one will be fooled by their deception. The very reason their deception succeeds is that they call their own decisions as Allah's order.

It is difficult for other nations to find out whether what their religious leaders say is true or false because they do not have their original divine books with them anymore. But our situation is different from them. We have Allah's Book exactly in its original form word for word and everyone has access to it.

It is fortunate that the door of the tavern is still open!

All we have to do is to take everything that is presented in the name of دین (*Deen*) and test it against this Book, and see whether it is really from Allah or whether it has been falsely attributed to Him.

The remedy is that love seeks freedom;
I prostrate before Him and seek wisdom!

Repeal of the current constitution

My dear friends, the first good thing we saw of the martial law was in terms of the land reform. The second important thing was to repeal the constitution which was, by and large non-Islamic; but our religious establishment had given fatwa that it was Islamic. We very much wanted that, without delay, the 1956 constitution be changed into Quranic constitution. But our only way was to do it through democratic and constitutional means; and all our efforts were directed in that direction. We were fully cognizant of the fact that this was a very slow process and the time was running fast. Many friends started saying to me that with this extremely slow approach how and when we will be able to

reach our destination?

The intention is going to take a long time to have any effect;
But who is going to live that long in order to see any effect?

I used to say to them that I fully realize your impatience but you should keep an eye on the value of patience in seeking your passion. But I could sense that this did not satisfy them. And thus hopelessness used to set even in those hearts who knew that hopelessness is unbelief. Under these conditions martial law came and with one stroke of pen declared the constitution null and void.

Love's one giant leap ended the whole story;
I thought the earth and heavens were limitless!

Construction after destruction

But this destruction is only one part of the process. And it is obvious that if construction does not follow destruction then the change, instead of being better, it becomes harmful. This is why the Quran says: فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ (2:256) – Whoever turns away from the wrong path of oppressive forces and comes to the right one has grasped the most trustworthy hand-hold which will never break. As Allama Iqbal says:

The destruction of the old opens the door for slow construction;
Illa (الا) did not have any that remain in the abyss of the La (لا)!

If you see from this point of view then we are standing at the place we were standing in 1947. That is, we have an independent state for which we have to create a constitution. The question is: What kind of constitution that should be? We, at Tulu-e-Islam tried continuously within our means until 1948, to explain to the nation: What was that ideology for whose practical implementation this land of Pakistan was acquired; and what is the constitution of an Islamic state? Although our effort to propagate the Quranic message surpassed our expectation; but the tactics of the status quo and selfish sections of our society were more effective in thwarting the practical implementation of the Quranic – hence Islamic – constitution in the state. It seems, on the Nature's scale of accountability, our destruction was not eternal. Therefore, we were given a second chance to redress for our past mistakes. Otherwise, it is the law:

That Nature overlooks the sins of individuals;
But it does not forgive the crimes of nations!

The question of framing a new constitution

But look at bad luck of the country? The moment the question of framing a new constitution arose, the same old forces of destruction that were busy for 9 years before in their "great Jihad" in making sure that this country's constitution

never becomes truly Islamic, raised their ugly heads to make sure, once again, that the new constitution does not become Islamic; that it does not reflect Quran's permanent values – no matter even if Islam becomes a laughing stock in front of the whole world; no matter the Islamic ideology becomes maligned in the world and appears as deceptive.

I want the dome of the proper setting destroyed;
Although, with it, I also fall and get destroyed!

Now, this debate about what is an "Islamic constitution" is being started anew and muddled. New questions are being raised about what are the distinguishing features of an Islamic state? Or that: Can an Islamic constitution be created in Pakistan, etc.? As I mentioned, I have written in detail about these topics in the past 10 years and there is neither need nor the time to go into them here. I think at this time it would be enough that I present to you briefly the core concepts of an Islamic state.

The difference between secular and Quranic state

The first question is: what is the difference between a secular state and the Quran's divine state? If one wants to go into details then it will be too long and too much to cover. But if we want to understand the principled difference between them then it could be explained in few words. The goal of a secular state is to protect interests of the nation and its people; and to achieve this goal *any* means that can be used are not just considered right but necessary. In other words, the principle – if it can be called a principle – is opportunistic expediency. It is not hidden from political thinkers that the leader of this political philosophy is the famous Italian intellectual Niccolò Machiavelli. He is the author the universally famous book, *The Prince*. The summery of the ideology that he advocates in this book is this:

Every tactic that leads to increased power of the state needs to be appreciated; and every deception that leads to success is worthy of praise and reverence. Justice is another word for power. One who has power has the right to own. This is the law of nature. Whether in peace or in war, the most effective weapon of the state is power and deception. The best characteristic a ruler must possess is cunningness like fox so that he could spread a web of deceit. He must display raw force so that he could terrorize wolves. He may not possess any virtue but appear to be greatly virtuous. It is okay if a virtue does appear in his heart but he should discard it right away without any hesitation and act against that virtue when time for any opportunistic expediency arises.

This is the bible of modern political philosophy about which Lord Grey said

that problems of states are not decided based on moral values.

And Lord Walpole said that a virtuous man cannot save an empire. This is because the length that one has to go to save an empire the virtuous person cannot go.

This is the politics about which morality is divided into two parts: one set of values for private morality and another set for public morality in political arena. The difference between the two is described by the famous Italian politician Cavour as: If we do in private what we do in public then we will be called great devils.

According to this measure the greatest devil is considered to be the "greatest patriot" and the state erects his statue and generations call him heroes.

This, my dear friends, is the basic concept of secular state. In contrast to this, the concept of divine state is that there are certain values of human life that are permanent and inviolable. These cannot be altered under any circumstances. In secular state the sovereignty belongs to majority; which means their representatives can make whichever laws they prefer by a majority vote. But in the Quranic state even 100% of the people cannot make any changes in the permanent values. The very existence of the Quranic state is to protect and preserve the permanent values. And these values are clearly described in the Quran. Islamic government is one which declares its goal as the realization of these permanent values in real life of its society. The constitution that will guarantee and protect these values will be called the Islamic constitution. These permanent values specify the boundary lines within which the Islamic government can create laws depending on the circumstances of a particular time and place. The principles will remain fixed and unchangeable but these laws may change. Islamic society is the reflection of this beautiful symbiotic combination of permanence and change like a tall tree whose roots are deep and firmly fixed in their place and whose branches reach the sky and are free to grow whichever way they wish: كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (14:24). Or like the bird which:

Flies higher in the wide expanse of the skies;
But keeps always focused on its home, its eyes.

This foundational principle of divine state is like the center of a circle; where if one leg of the compass is firmly fixed at the center then the other leg keeps on creating perfect bigger and bigger circles by extending itself. If the leg on the center wavers even slightly then the circle gets crooked.

Unchangeable principles

At this point you must be wondering what these unchangeable principles are that form the basis of Islamic state and its constitution. It will take long time to explain the details of the permanent values. So, at this time, I will try to introduce to you some of these values so that you can see what their features are.

One concept of human life is that human beings are defined essentially by physical body which comes into existence according to physical laws. Its machinery remains alive according to physical laws and when this machinery stops working then its cells disintegrate. This is called death which ends human life. This concept of human life is called the materialistic concept of life.

Human self or personality

The other concept of human life is that it not only consists of human body but it has something else which is called "human self" or "human personality"; and which is not the product of any physical evolutionary process nor is it subject to any physical laws. This is granted to everyone by God; but it is given in undeveloped or potential form with the possibility that it can be developed and its potential could be realized. If it is developed and realized, then it does not die with the death of the physical body; but continues to live and marches forward on its onward evolutionary journey.

Just as there are laws for the development of the human body, there are laws for the development for the human self as well. These are the laws which are called by the Quran as unchangeable values or permanent values. If human leads his life according to these values then his self continues to develop. If he deviates from these values then his self becomes weak and disintegrates. However, humans cannot lead life at the individual level according to these values. These permanent values require that life be lived collectively under them which are constitutionally implemented and protected by law at the societal level in the Islamic state as a whole. Thus the Islamic state is nothing but the reflection of these values. The sole reason the Islamic state comes into existence is for the goal of facilitating the development of the human body *and* human *self*. Thus the Islamic state is *not* the end, but it is only a means to achieve this goal.

To Be Continued....

محسوس سجدہ اس کے اس پرخلوص جذبہ کا بیساختہ مظہر نہیں اور محض (Form) ہی (Form) ہے' تو اس سجدے کے کوئی معنی نہیں۔ درحقیقت رکوع وسجود وعبادت کی روح انسان کے جذبہ فرماں پذیری اور اطاعت کے محسوس مظہر ہیں۔ اگر انسان خدا کی اطاعت تو نہ کرے اور صرف اس محسوس شکل کو مقصود بالذات سمجھ لے' تو نہ صرف خدا کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں بلکہ قرآن کریم کے الفاظ میں انسان کے لئے تباہی کا موجب ہے۔ قرآن کریم میں ان محسوس ارکان (Form) کی تھوڑی سی شکل صلوٰۃ اور حج کی تقاریب میں باقی رکھی گئی ہیں اور وہ بھی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی عمل ہیں۔ جن میں ضروری ہوتا ہے کہ ان کی محسوس شکل میں یک جہتی اور ہم شکلی ہو۔ یہ اجتماعی شکل نزول قرآن کے وقت میں' نبی اکرم ﷺ اور جماعت مومنین میں رائج تھی اور مساجد میں ادا کی جاتی تھی۔ جس طرح سجدہ سے مراد صرف سر کو زمین پر رکھنا نہیں بلکہ اس سے مفہوم قوانین خداوندی کے سامنے سر جھکا دینا بھی ہے' اسی طرح مسجد سے بھی بالخصوص وہ عمارت نہیں جس میں نماز ادا کی جاتی ہے۔ اس سے مراد وہ مقام ہے جو نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں لیا جاتا تھا جو اس نظام کا مرکز ہو جس کی رو سے قوانین خداوندی کی اطاعت کی یا کرائی جائے۔ اس میں اسلامی مملکت کے مختلف امور سرانجام دیئے جا سکتے ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے ''عبادت'' کے معنی اطاعت کے ہیں اور دنیا کا کوئی کام جو قوانین خداوندی کے مطابق کیا جائے عبادت ہو جاتا ہے۔ اجتماع صلوٰۃ بھی چونکہ قانون خداوندی کی اطاعت ہے اس لئے وہ بھی عبادت ہے۔ ''عبادت'' کے لئے کسی ایسے الگ مکان کی ضرورت نہیں جس میں اور کچھ نہ کیا جا سکے۔

عبادت کا مفہوم سمجھنے کے لئے یہ ملحوظِ نگاہ رکھنا ضروری ہے کہ:

(1) قرآن میں جہاں اللہ کی عبادت کا ذکر ہوگا' اس کے معنی قوانین خداوندی کی برضا و رغبت اطاعت ہوں گے (1:5)۔

(2) قرآن میں جہاں طاغوت اور شیطان کی عبادت کا ذکر ہوگا' اس سے مفہوم یا تو انسانوں کے خود اپنے جذبات یا من دون اللہ' باطل پرست مذہبی پیشواؤں کی اطاعت ہوگی' اِن سے منع کیا گیا ہے (19:44 ,30:13)۔

(3) قرآن میں جہاں بتوں یا دیوی دیوتاؤں کی عبادت کا ذکر ہوگا' وہاں مفہوم اِن کی توہم پرستانہ پرستش ہوگا (19:42)۔

(4) قرآن میں عبادُ الرَّحمٰن کے معنی ہیں وہ لوگ جو زندگی کی ہر سانس میں قوانین خداوندی کی اطاعت کریں (51:56)۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 71
ISSUE
9

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

6 ستمبر یومِ دفاعِ پاکستان

